بِسم اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّ حِیۡمِ

اتحادِ ملّت

ضرورت ، اهمیت
اور
طریقه

تالیف :

مولانا ریاض احمد خاں

پیشکش :

اداره دعوة القرآن

۵۹ر محمد علی روڈ، ممبئ ۴۰۰۰۰۳ ☆ فو ن : ۲۳۴۶۵۰۰۵

چوتھا ایڈیشن جون ۲۰۱۶ء تعداد :۱۰۰۰ر ہزار قیمت: ۳۵ر روپئے Rs. 35 /-

فہرست

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
۳	عرض ناشر	٦٧	مشترک عظیم مقاصد کے حصول کیلئے باہمی جدوجہد
۴	پیش لفظ	٦٩	متفق علیہ امور میں باہمی تعاون
۷	اتحاد ملت،ضرورت، اہمیت اور طریقہ	۷۴	اختلافی مسائل میں باہمی نرمی وفیاضی
۱۲	احادیث میں امت کے افتراق اور اختلاف کی مذمت	۸۱	کلمہ گو کی تکفیر سے اجتناب
۱۵	اسلام میں تفرقہ واختلاف ناپسندیدہ عمل ہے	۸٦	اتحاد ملت کیلئے مطلوبہ اخلاقی اوصاف
۱۷	امت کا تفرقہ دائمی ولازمی نہیں ہے	۹۰	شخصی، گروہی اور مسلکی عصبیت سے آزادی
۲۳	دین میں اتحاد واختلاف کے دائرے کا علم وفہم	۹۵	تقلید محض اور تعصب، غلط اور مذموم ہے
۴۳	اختلافی امور ومسائل میں اعتدال کی راہ	۹۹	تقلید محض نہ تو پوری امت پر واجب ہے اور نہ حرام
۵۰	محکمات پر توجہ وعمل، اور متشابہات سے اجتناب	۱۰۱	غیروں کے ساتھ حسن ظن
۵۳	اجتہادی امور میں باہمی اختلاف کی شدت سے اجتناب	۱۰٦	الزام اور طعن وتشنیع سے اجتناب
۵۵	فروعی واجتہادی امور میں علماء کے باہمی اختلاف کا علم	۱۰۹	اختلافی امور میں سختی کے بجائے نرمی وفیاضی
٦۲	الفاظ واصلاحات کے مفہوم کی وضاحت اور حد بندی	۱۱۳	بحث ومباحثہ میں احسن طریقہ
		۱۱۹	اجتہادی اور فروعی اختلافات اور ملتِ اسلامیہ کا نصب العین

بسمہٖ تعالیٰ

عرض ناشر

زیر مطالعہ کتاب ''اتحاد ملت ضرورت، اہمیت اور طریقہ'' مولانا ریاض احمد خاں کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ''زندگیِ نو'' (دہلی) میں قسط وار شائع ہوئے ہیں۔ اس درمیان میں بہت سے قارئین نے اس موضوع کی اہمیت کی وجہ سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ انہیں کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ اور کچھ قدردانوں کی طرف سے پہلے ہی سے آرڈر بھی آنے شروع ہو گئے۔ لہٰذا موصوف کی نظر ثانی کے بعد ادارہ نے اس کتاب کو شائع کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

مولانا ریاض احمد خان کو ''اتحاد ملت'' کی فکر جنون کی حد تک دامن گیر ہے یہی وجہ ہے کہ جب بابری مسجد کی شہادت کے بعد ''چوری اور سینہ زوری کے مصداق'' حکومت نے جماعت اسلامی ہند پر پابندی عائد کی، تو اس خطرہ کے علی الرغم کہ جماعت اسلامی کا رُکن ہونے کی وجہ سے کسی سیاسی کارروائی میں حصہ لینا جرم قرار دیا جاسکتا ہے، آپ نے ممبئی شہر میں علماء کاؤنسل کی داغ بیل ڈالنے میں بھرپور حصہ لیا۔ اس کی واحد غرض یہی تھی کہ کسی طرح ملت میں اتحاد پیدا ہو جائے۔ اور یہی وجہ اس کتاب کی تالیف کے لئے تحریک بنی۔ اس کے لکھنے میں انہوں نے جو محنت کی اس پر قارئین نے انہیں بھرپور خراج تحسین پیش کیا اور دعائیں دی ہیں۔

مولانا شمس پیرزادہؒ کے انتقال پُرملال کے بعد موصوف چیرمین کی حیثیت سے ادارہ کی سرپرستی کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔ آمین

محمد صدیق قریشی

سکریٹری

ادارہ دعوۃ القرآن ممبئی ۴۰۰۰۰۳

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں خیر و شر اور حق و باطل کو ایک ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس لئے یہاں اہل حق اور اہل باطل کی کشمکش اور لڑائی منطقی اور ناگزیر ہے، جس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے بلکہ حیرت اور تعجب تو اس وقت ہوتا جب دنیا میں اہل باطل، حق کو مٹانے کیلئے کوئی صف بندی اور لڑائی نہ کرتے۔ جس سے اہل ایمان کو اللہ نے یوں آگاہ کیا ہے۔

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ط

''وہ تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہارے دین سے تم کو پھیر دیں''۔ (البقرہ: ۲۱۷)

لیکن آج حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ ایک خدا، ایک رسول، ایک قرآن اور ایک دین کے ماننے والے، فروعی و اجتہادی مسائل کے اختلاف کی وجہ سے باہم دست و گریباں ہیں، جب کہ اللہ نے امت کو اتحاد و اتفاق کا صریح حکم دیا ہے۔ اور باہمی اخوت کو اپنی نعمت قرار دینے کے ساتھ اسے قوت و غلبہ کی علامت کہا ہے۔ اور اختلاف و تفرقہ سے اسے منع فرمایا ہے۔ تنازعہ اور لڑائی کو اس کی ہوا خیزی اور شکست کا پیش خیمہ بتایا ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ ط

''اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائیگی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔'' (الانفال۔۴۶)

یہ بات ہر صاحبِ فکر و نظر پر واضح ہے کہ اسلام کی خدمت، اشاعت، سربلندی اور اقامت کا

کام پوری امت پر فرض ہے۔اور کسی ایک جماعت یا گروہ کی اجارہ داری نہیں ہے۔اس لئے ان فرائض کی ادائیگی کے لئے امت کی متعدد اور الگ الگ جماعتیں بیک وقت ہوسکتی ہیں۔بشرطیکہ ہر جماعت اپنے الگ الگ دائرہ کار اور طریقے پر کام کرتے ہوئے، دوسری جماعت کے کاموں کی اہمیت کی معترف اور قدر دان ہو اور نیکی و بھلائی کے کاموں میں تعاونِ باہمی بھی کرتی ہو۔تاکہ ایک جماعت کا کام اور قوت دوسری جماعت کے کام کی تقویت اور تکمیل کا سامان فراہم کرے۔اس طرح اسلام کی اشاعت و سربلندی کے مشترک مقصد کے لئے کام کرنے والی جماعتیں الگ الگ ہونے کے باوجود، اللہ کی محبوب جماعت کے مانند، سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح باہم جڑی ہوئی بھی ہوں۔(سورۃ الصّف۔آیت ۴)

لیکن آج اسلام کی اشاعت اور سربلندی کیلئے کام کرنے والی مختلف جماعتوں کو دیکھ کر، دل پارہ پارہ ہوجاتا ہے کہ وہ باہمی تعاون کے بجائے ایک دوسرے کی حریف بنی ہوئی ہیں۔باہمی بغض وعداوت عام ہے۔اشاعتِ اسلام کے مشترک نقطہ اتحاد و اتفاق کے باوجود، ہر جماعت کی توجہ جزئی وفروعی اختلاف پر مرکوز ہے۔ہر جماعت اپنی فکر، نقطہ نظر اور طریقہ کار کو خطا سے مبرا اور پاک اور دوسروں کی فکر، نقطہ نظر اور طریقہ کار کو غلطی کا مجموعہ سمجھ رہی ہے۔

جب کہ حق یہ ہے کہ فروعی و اجتہادی امور و مسائل اور بعض غیر اساسی اصولوں میں اختلاف فی نفسہ خطرے کی چیز نہیں ہے کیوں کہ صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور ائمہ ہدیٰؒ کے وقت میں اس طرح کے اختلافات موجود تھے۔لیکن ان کی وجہ سے ان کے درمیان کوئی گروہ بندی نہیں ہوئی۔دراصل خطرے کی بات یہ ہے کہ ان جزئیات کی وجہ سے امت کے درمیان دشمنی اور افتراق پیدا ہوجائے، جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے۔ (سورۂ آل عمران آیت۔۱۰۵)

ہماری نظر میں امت مسلمہ کی اس صورت حال کا ایک بڑا سبب، اسلام میں اختلاف کی فکری و اخلاقی آداب وحدود سے امت کے سوادِ اعظم کی ناواقفیت اور لاعلمی ہے۔یہ حقیر کوشش اسی کو دور

کرنے کے لئے کی گئی ہے اس میں جو کچھ خیر اور حق ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔اور خامیوں کا ذمہ دار میں خود ہوں۔

دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ ہمیں وہ نور عطا فرما، جو تاریکیوں میں صراط مستقیم کی رہنمائی فرمائے۔ وہ کسوٹی عطا فرما، جو حق کو باطل سے ممتاز کردے۔اور وہ توازن عطا فرما، جو ہمیں افراط وتفریط کی گمراہیوں سے بچائے، آمین۔ رَبَّنَا اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا ، وَاغۡفِرۡلَنَا ، اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَيۡءٍ قَدِيۡرٌ ؕ

رياض احمد، ملت نگر

ممبئی

۲۶/جولائی ۲۰۰۰ء

اتحادِ ملّت

ضرورت، اہمیت اور طریقہ

اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے امت مسلمہ کے اتحاد و اتفاق، محبت، بھائی چارہ اور تعاون باہمی کو نعمت، عزت و سر بلندی کی ضمانت اور دین داری کی علامت قرار دیا ہے اور امت کے افتراق، انتشار اور اختلاف باہمی کو اللہ کے غضب کی علامت، بے دینی، پستی اور ذلت و رسوائی کا سبب بتایا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

یٰۤاَیُّھَاالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِیۡعُوۡا فَرِیۡقاً مِّنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُواالۡکِتٰبَ یَرُدُّوۡکُمۡ بَعۡدَ اِیۡمَانِکُمۡ کٰفِرِیۡنَ ● وَکَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتُ اللّٰہِ وَفِیۡکُمۡ رَسُوۡلُہٗ ؕ وَمَنۡ یَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ ھُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ● یٰۤاَیُّھَاالَّذِیۡنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰاتِہٖ وَلَاتَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ● وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًاوَّ لَا تَفَرَّقُوۡا ص وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ

”اے ایمان والو! اگر اہل کتاب میں سے کچھ لوگوں کی بات تم نے مانی تو وہ تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف لوٹا دیں گے۔ اور تم کفر کیوں کر کرو گے، جب کہ تم پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور اللہ کا رسول تمہارے درمیان موجود ہے۔ اور جس نے اللہ کا سہارا لیا تو اسے ضرور سیدھی راہ کی رہنمائی ملے گی۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد

اِذۡکُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا ج وَکُنۡتُمۡ عَلٰی شَفَاحُفۡرَۃٍ مِّنَ النَّارِ

رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے،

فَاَنۡقَذَکُمۡ مِنۡھَاؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَھۡتَدُوۡنَ ● وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ وَیَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡھَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِؕ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ● وَلَاتَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ تَفَرَّقُوۡا وَاخۡتَلَفُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَ ھُمُ الۡبَیِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِکَ لَھُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ●

(آل عمران : ۱۰۰ ـ ۱۰۵)

اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ تم ان سے اپنی فلاح کا راستہ پالو۔ اور تم میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف دعوت دیں، بھلائی کا حکم کریں اور برائی سے روکیں، اور جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ اور کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے باوجود اختلاف میں پڑ گئے۔ ان کیلئے بڑا عذاب ہے“۔

مندرجہ بالا آیات میں اسلام اور تقویٰ کی تاکید کے ساتھ اہل ایمان کو متحد ہو کر، قرآن کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے اور باہمی تفرقہ و اختلاف سے بچنے کا جو حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس کے چند اہم نکات یہ ہیں:۔

(۱) اہل اسلام کو اہل کتاب کی اطاعت و پیروی سے، اور ان کے مذموم ارادوں اور خفیہ چالوں سے خبردار کیا گیا ہے کہ تم نے اگر ان کی بات مانی تو وہ اپنے وسوسوں اور چالوں سے تمہیں ایمان، اخوت و اتحاد کے بعد کفر و افتراق کی طرف پلٹا دیں گے۔

(۲) اہل اسلام کی اجتماعیت اور وحدت کے لئے سب سے بڑا اور ضروری کام یہ ہے کہ تمام

اہل ایمان مل کر اللہ کی رسی ، یعنی قرآن کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیں اور اس کام میں افتراق و اختلاف سے بچیں۔

(۳) مسلمانوں کو یاد دلایا گیا ہے کہ ایمان کے بعد سب سے عظیم نعمت، اخوت ومحبت کی وہ نعمت ہے جو جاہلیت کی عداوت ،نفرت اور باہمی جنگ کے بعد تمہیں حاصل ہوئی ہے، اس لئے اس نعمت کی قدر اور اس کی حفاظت کرنا تم پر لازم ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جس کے حصول کے لئے اگر تم زمین کی ساری دولت لٹا دیتے تو تمہارے دل باہم اس طرح نہ جڑتے۔ یہ تو اللہ ہے جس نے اپنے دین اور قرآن کے ذریعہ تمہارے دلوں کو باہم اخوت ومحبت سے جوڑ دیا۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ط (الانفال ۔ ۶۳)

”اے نبیؐ! اگر آپ زمین کی ساری دولت خرچ کر ڈالتے تو بھی ان لوگوں کے دل نہ جڑتے، مگر وہ اللہ ہے جس نے ان کے دل باہم جوڑ دیئے۔“

(۴) دنیا میں قوموں کے اندر اتحاد و اجتماعیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان کے سامنے زندگی کا کوئی عظیم مقصد و نصب العین ہوتا ہے اور کوئی بلند پیغام یا دعوت ہوتی ہے جس کو انسانوں تک پہنچانے کیلئے وہ جدوجہد کرتی ہیں۔ اللہ نے امت مسلمہ کو دعوت الی الخیر و شہادت علی الناس کا عظیم و اعلیٰ مقصد و نصب العین عطا فرمایا ہے۔ اور اس بات کی تاکید بھی فرمائی ہے کہ جنس، رنگ، وطن، زبان اور طبقات کے اختلاف کے باوجود تم امت واحدہ ہو، امت وسط ہو، خیر امت ہو۔ میں نے تمہیں انسانوں کے سامنے، اپنے دین اسلام کی قولی و عملی شہادت کے لئے منتخب کیا ہے اور باہم مل کر بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا تمہارا فرض منصبی قرار دیا ہے ۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء ۔ ۹۲)

”یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک امت ہے، اور میں تمہارا پروردگار ہوں، پس تم میری عبادت کرو۔“

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

”اور اسی طرح سے تو ہم نے تم (مسلمانوں) کو ایک امت وسط

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ ۔ ۱۴۳)

بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے تمام انسانوں پر گواہ بنو۔“

كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران:۱۱۰)

”اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو۔“

اس کے ساتھ قرآن اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان مضبوط اخوت، وہ مقدس رشتہ ہے جو ایمان کی حقیقی معرفت، تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے جس کی تعبیر قرآن نے یوں کی ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الحجرات:۱۰)

”حقیقت میں مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا اپنے دو بھائیوں کے تعلقات کو درست کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔“

سورہ الحجرات کی یہ آیات اہل ایمان کے قلب میں بلند و اعلیٰ اخلاقی اوصاف و آداب کی ان دیواروں کو قائم کرتی ہیں جو تمسخر، طعنہ، بُرے القاب، سوءِ ظن، تجسس اور غیبت کے غبار اور اس کی گندگی سے ایمان کو گرد آلود اور گندا ہونے سے بچاتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ ج وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ط بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ●

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نہ مرد، دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں؛ ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں، دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ نہ آپس میں ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں شہرت بہت بُری بات ہے۔ جو لوگ اس سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ

الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوۡا وَلَا يَغۡتَبۡ بَّعۡضُكُمۡ بَعۡضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمۡ اَنۡ يَّاۡكُلَ لَحۡمَ اَخِيۡهِ مَيۡتًا فَكَرِهۡتُمُوۡهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ الرَّحِيۡمٌ ● (الحجرات:۱۱۔۱۲)

بہت گمان کرنے سے بچو، کیوں کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں تجسس نہ کرو، تم سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے؟ (ہرگز نہیں، تو دیکھو! تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔"

قرآن نے امت مسلمہ کو نہایت شدت کے ساتھ تفرقہ واختلاف سے خبردار کیا ہے اور اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو سخت سزا کی وعید سنائی ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِيَعًا لَّسۡتَ مِنۡهُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ ؕ (انعام۔۱۵۹)

"حقیقت میں جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے تو اے نبیؐ، آپ کا ان سے کوئی رشتہ نہیں۔"

حضرت عائشہؓ سے حضور ﷺ نے پوچھا کہ اس آیت سے مراد کون لوگ ہیں؟ اور پھر خود ہی اس کا جواب دیا کہ "اس سے مراد، اس امت کے درمیان تفرقہ ڈالنے والے گمراہ لوگ، بدعتی اور خواہش نفس کے بندے ہیں۔ اے عائشہؓ! میں ان سے اعلان برأت کرتا ہوں، وہ مجھ سے الگ ہیں۔" (الاعتصام، جلد:۱، صفحہ:۳۸)

علامہ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ اس آیت کا مخاطب، عمومی اور ظاہری طور پر ہر وہ فرد یا گروہ ہے جو دین اسلام میں تفرقہ واختلاف پیدا کرنے والا ہو۔ کیوں کہ اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کردے۔ اور اس دین کی شریعت ایک ہے جس میں کوئی اختلاف وافتراق نہیں ہے۔ پس جو کوئی اس شریعت میں اختلاف پیدا کرے گا، وہ تفرقہ کا شکار ہو گیا۔ سورۂ شوریٰ کی آیت اَنۡ اَقِيۡمُوا الدِّيۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِيۡهِ یعنی دین کو قائم کرو اور

تفرقہ واختلاف سے بچو، میں دین کو قائم کرنے اور افتراق واختلاف سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔

احادیث میں امت کے افتراق اور اختلاف کی مذمت:

احادیث میں اہل ایمان کو، وحدت محبت اور اخوت کا حکم دیا گیا ہے اور ہر اس کام سے روکا گیا ہے جس کے نتیجے میں بغض، نفرت، عداوت اور باہمی اختلاف وتفرقہ پیدا ہوتا ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

● عليكم بالجماعة ، واياكم والفرقه، فان الشيطان مع الواحد، وهو من الاثنين أبعد ، من أراده بحبوحة الجنة فليلزم الجماعة ۔(رواه الترمذی ، وقال حسن صحيح غريب)

"تم پر تفرقہ سے بچنا اور جماعت سے جڑے رہنا فرض ہے کیوں کہ اکیلے انسان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور دو سے وہ دور بھاگتا ہے تو تم میں سے جو جنت کی خوشبو روشنی چاہتا ہے اسے چاہئے کہ وہ جماعت سے لازماً جڑ جائے"۔

● ان اللّٰه لا يجمع أمتي أو قال: أمة محمدؐ، على ضلالة ،وَيَدُ اللّٰهِ مَع الجماعة ومن شَذَّ شُذَّإلى النار۔(ترمذی ، ۲۱۶۸ عن ابن عمرؓ)

"اللہ تعالیٰ میری امت کو، یا آپؐ نے یہ کہا امت محمد کو ضلالت پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کا ہاتھ (یعنی تائید) جماعت کے ساتھ ہے؛ اور جو جماعت سے الگ ہوا وہ آگ میں گیا۔"

● المسلم أخ المسلم ، ومن كان فى حاجة اخيه كان الله فى حاجته۔ (عن ابن عمرؓ ، متفق عليه)

"ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور جو اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں مصروف ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری کرے گا۔"

● لا يؤمن احدكم حتّىٰ يحب لأخيه مايحب لنفسهٖ ۔

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے مؤمن بھائی کے لئے بھی وہی پسند۔

(عن انسؓ، اللؤلؤ والمرجان، ۲۸)

نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔"

● والذی نفسی بیده ، لا تدخلون الجنة حتی تؤمنوا، ولا تؤمنوا حتی تحابوا ، ألا أدلكم علی شيءٍ إن فعلتموه تحاببتم ؟ افشوا السلام بينكم ۔
(عن ابی ہریرہؓ، مسلم: ۹۳)

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ایمان کے بغیر تم جنت میں نہیں جا سکتے اور باہمی محبت کے بغیر تم مؤمن نہیں ہو سکتے۔ کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتاؤں جس پر اگر تم عمل کرو تو باہم محبت کرنے لگو۔ اپنے درمیان سلام کو رواج دو۔"

●لاتباغضوا ولاتحاسدوا ولاتدابروا، وكونوا عبادالله إخوانا، ولايحل لمسلم ان يهجرأ خاه فوق ثلاثة أيام۔
(متفق علیہ، عن انسؓ،: ۱۶۵)

" آپس میں ایک دوسرے سے بغض و کینہ نہ رکھو، نہ حسد کرو اور نہ دشمنی وعدوات کرو۔ بلکہ اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو، کسی مسلم کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے مسلم بھائی سے کنارہ کش رہے۔"

● اياكم والظن ، فإن الظن اكذب الحديث ولا تُحَسَّسُوْا ، ولا تجسسوا ولا تنا جشو ا ولا تحاسدوا، ولا تباغضوا ولا تدابروا، كونوا عبادالله إخوانا
(متفق عليه ، عن ابی هريرهؓ)

"مسلمانو! بدگمانی سے بچو، کیونکہ ظن نہایت جھوٹی بات ہے۔ اور باہم ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہو، تجسس سے بچو اور بدخواہی میں کسی کا سودا خراب نہ کرو، باہم حسد بغض اور دشمنی نہ کرو بلکہ اللہ کے بندے بھائی بھائی بن کے رہو۔"

●المسلم أخ المسلم، لا يظلمه، ولا يخذله ولا يحقرهٗ، التقویٰ هٰهُنَا (ويشير الی صدره ثلاث مرات) بحسب إمری مِنَ الشر أن يحقر أخاه المسلم ، كل المسلم علی المسلم حرام ۔ دمه وماله و عرضهٗ

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ تو ایک بھائی دوسرے بھائی پر ظلم نہیں کرتا۔ اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ اور اس کی بے عزتی اور تحقیر نہیں کرتا۔ (آپ ؐ نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کرکے تین بار فرمایا) تقویٰ یہاں ہے کسی شخص کے بُرا ہونے کیلئے یہی کافی ہے

(مسلم، عن ابی ہریرہؓ)

کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو گری نظر سے دیکھے، ایک مسلمان کا خون، اس کا مال اور عزت، سب دوسرے مسلمان پر حرام ہیں۔"

● ألا أخبركم بأفضل من درجة الصلوٰة والصيام والصدقة ؟ قالوا : بلیٰ يا رسول اللّٰہِ قال صلاح ذات البين، فإن فساد ذات البين الحالقة ؛ لا أقول تحلق الشعر ولكن تحلق الدين
(ترمذی، ۲۵۱۱)

"حضورؐ نے صحابہ سے پوچھا کہ کیا میں تمہیں نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے افضل عمل نہ بتاؤں؟ صحابہ نے کہا ہاں، اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ نے فرمایا: مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو درست کرنا اور ان کے درمیان صلح صفائی کرانا۔ کیونکہ مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی خرابی تو مونڈنے والی ہے۔ میں سر مونڈنے کی بات نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ تو دین کو جڑ سے ختم کر دینے اور مونڈنے والی چیز ہے۔"

● ثلاثة لا ترفع صلاتهم فوق رؤسهم شبرا: رجل أم قوما وهم له كارهون، وإمرأة باتت و زوجها عليها ساخط، و إخوان متصادمان ، (ابن ماجہ، ۹۷۱)

" تین قسم کے لوگوں کی نماز قطعاً مقبول نہیں ہوتی: ایک وہ امام جسے اس کے مقتدی ناپسند کرتے ہوں۔ دوسرے، وہ عورت جس نے اس حال میں رات گذاری کہ اس کا شوہر اس سے ناراض رہا۔ تیسرے، دو ایسے بھائی جو برسرپیکار ہوں۔"

● من هجر أخاه سنة، فهو كسفك دمه
(ابوداؤد ، ۴۵۱۵)

"جس شخص کے تعلقات اپنے بھائی سے ایک سال تک منقطع رہے تو گویا اس نے اس کا خون کر دیا۔"

● إن الشيطان قد أيس إن يعبده المصلون فی جزيرة العرب ، ولكن فی التحريش بينهم (مسلم ، عن جابر بن عبداللّٰه)

" شیطان تو اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ جزیرۃ العرب کے نمازی اب اس کی عبادت کریں گے البتہ اسے اس بات کی امید ہے کہ وہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتا اور لڑاتا رہے گا"۔

اسلام میں تفرقہ واختلاف ناپسندیدہ عمل ہے:

اسلام میں تفرقہ واختلاف کس قدر مذموم ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے تفرقہ واختلاف کے اندیشے سے صحابہ کرامؓ کو ایک ساتھ مل کر تلاوت قرآن کرنے سے منع کر دیا۔ کیوں کہ تلاوت قرآن کے لہجے میں ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ تاکہ ان کا یہ اختلاف کہیں انہیں تفرقہ وشر میں مبتلا نہ کر دے۔ اور فرمایا:

إقرا ؤالقرآن ماإئتلفتْ عَلَيْهِ قُلُوبُكُمْ، فَإذاإخْتَلَفْتُمْ فقُو مُوْ ا عَنهُ۔

’’یعنی تم باہم مل کر قرآن پڑھو اور سمجھو، جب تک تمہارے دل قرأت قرآن کے لہجے اور معنیٰ پر باہم متفق اور جڑے ہوئے ہوں۔ لیکن جب تمہارے درمیان قرأت (کے لہجے اور معنیٰ) میں اختلاف ہو جائے تو فوراً اس کو چھوڑ کر اٹھ جاؤ۔ کہ تمہارا یہ اختلاف کہیں تمہیں شر وفساد اور تفرقہ میں مبتلا نہ کر دے۔‘‘

چنانچہ عمرو بن ہشامؓ وعبداللہ بن مسعودؓ کے درمیان قرأت کے اختلاف کو حضورؐ نے (کلا کما محسن، کہہ کر) دونوں کی تصویب وتحسین فرما دی۔

جہاں تک فہم قرآن میں اختلاف کا تعلق ہے، تو اس باب میں حضورؐ نے قرآن کی آیات محکمات کو جو قرآن کی اصل اور جڑ ہیں جنہیں اللہ نے ام الکتاب کہا ہے ان میں غور وتدبر کرنے اور ان کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور ان آیات پر کاربند رہنے کا حکم دیا ہے جو اتحاد واتفاق پر اُبھارتی ہیں۔ ساتھ ہی حضورؐ نے قرآن کی آیات متشابہات پر غور وفکر کرنے سے منع فرمایا ہے اور ان لوگوں سے دور رہنے اور بچنے کا حکم دیا ہے جو ان آیات کی اتباع کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

● فَإِذَا رَأَيْتُمُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهُ مِنْهُ فَاحْذَرُوهُمْ (متفق علیہ)

’’پس جب تم کچھ لوگوں کو قرآن کی آیات متشابہات کی اتباع کرتے دیکھو تو ان سے بچو اور دور رہو۔‘‘

● نَزَلَ الْقُرْآنَ عَلىٰ خَمْسَةِ اَوْجِهِ: حَلَالٍ وَحَرَامٍ وَمُحْكَمٍ وَ مُتَشَابِهٍ وَ امثالٍ، فَاَحِلُّوا الْحَلَالَ، وَحَرِّمُوا الْحَرَامَ وَاعْمَلُوا بِالْمُحْكَمِ وَ آمَنُوا بِالْمُتَشَابِهِ وَاعْتَبِرُوا بِالْأَمْثَالِ (مشکوٰۃ)

’’قرآن کریم میں پانچ قسم کی آیات ہیں: حلال، حرام محکم، متشابہ اور امثال۔ پس تم حلال کو حلال جانو اور حرام کو حرام مانو اور محکم پر عمل کرو اور متشابہ پر ایمان لاؤ اور امثال وقصوں سے عبرت حاصل کرو۔‘‘

حضورؐ نے امت کو اتحاد واتفاق کی نہایت تاکید فرمائی ہے کیوں کہ اگر اتحاد واجتماعیت طاقت کی علامت ہے تو اختلاف وانتشار، ضعف وکمزوری کی پہچان۔ اجتماعیت واتحاد سے کمزور قوم، طاقتور ہو جاتی ہے اور طاقتور قوم کی طاقت میں اس سے مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح قوم ہلاکت وبربادی سے محفوظ رہتی ہے۔ جب کہ اکیلا شخص گر سکتا ہے، بھٹک سکتا ہے، ضائع وبرباد ہو سکتا ہے اور شیاطین جن وانس اس کو اپنا شکار آسانی سے بنا سکتے ہیں۔ لیکن جو شخص جماعت کے ساتھ اس کی پناہ میں رہتا ہے، وہ اس بکری کی مانند ہے جو ریوڑ کے بیچ میں ہو جسے بھیڑیا آسانی سے حملہ کر کے اپنا شکار نہیں بنا سکتا بمقابلہ اس بکری کے، جو ریوڑ سے الگ ہو کر دور چلی جاتی ہے اور بھیڑیا اسے آسانی سے شکار کر کے کھا جاتا ہے۔ حضورؐ کی درج ذیل احادیث اسی اتحاد و اجتماعیت کی دعوت دیتی ہیں:

● إِنَّ الشَّيْطَانَ ذِئْبُ الإِنْسَانِ، وَإِنَّمَا يَأْكُلُ الذِّئْبُ مِنَ الْغَنَمِ الْقَاصِيَةَ (ترمذی)

’’حقیقت میں شیطان، انسان کے لئے بھیڑئے کے مانند ہے اور بھیڑیا اکیلی بکری کو آسانی سے کھا جاتا ہے۔‘‘

● عَلَيْكُم بِالْجَمَاعَةِ، فَإِنَّ

’’تم پر جماعت سے وابستہ رہنا فرض ہے۔‘‘

الشَّيۡطَانَ مَعَ الۡوَاحِدِ، وَهُوَمِنَ الۡاَثۡنَيۡنِ اَبۡعَدُ۔ (ترمذی)

کیونکہ اکیلے آدمی کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور دو آدمی سے وہ دور ہوتا ہے''۔

●المُؤمِنِ لِلۡمُؤۡمِنِ كَالۡبُنۡيَانِ يَشُدُّ بَعۡضُهٗ بَعۡضاً، شَبَّكَ بَيۡنَ اَصَابِعِهٖ (متفق علیہ)

''ایک مؤمن دوسرے مؤمن کیلئے عمارت کی مانند ہے جس کا ایک جُز دوسرے کیلئے تقویت کا باعث بنتا ہے۔ آپؐ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کر کے دکھایا۔''

امت کا تفرقہ دائمی ولازمی نہیں ہے:

ایک طرف امت کے اتحاد واجتماعیت کی ضرورت پر دلالت کرنے والی خدا اور اس کے رسولؐ کی مذکورہ بالا تعلیمات ہیں، تو دوسری طرف امت کو اختلاف وتفرقہ سے محفوظ رکھنے کیلئے حضورؐ کی وہ دعا ہے جسے اللہ نے رد کر دیا اور قبول نہیں فرمایا، اور وہ احادیث ہیں جن میں امت مسلمہ کے تہتر فرقوں میں بٹ جانے کا ذکر ہے؛ اور یہ بتایا گیا ہے کہ ایک کے علاوہ باقی سارے فرقے جہنم میں جائیں گے۔

یہ، اور اسی طرح کی دوسری احادیث کو دیکھ کر، امت کے بعض افراد کو یہ غلط فہمی لاحق ہوگئی کہ امت کا موجودہ اختلاف وافتراق خدا کا اٹل فیصلہ ہے جس سے نجات ومفر ناممکن ہے۔ اس لئے امت کے اتحاد واتفاق کے لئے کوشش لاحاصل ہے۔ اس غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔

جہاں تک حضورؐ کی دعا والی احادیث صحیحہ کا معاملہ ہے تو وہ سب، مضامین کے معمولی اختلاف و فرق کے ساتھ متعدد جلیل القدر صحابہؓ سے مروی ہیں۔ لیکن وہ ساری احادیث امت کے تفرقہ و اختلاف کے ناگزیر ہونے پر دلالت نہیں کرتی ہیں، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے۔ بلکہ وہ اس

بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے، امت کے حق میں حضورؐ کی تین دعاؤں میں سے پہلی اور دوسری دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ یعنی اول یہ کہ سماوی وارضی عذابوں کی ہلاکت سے امت مسلمہ کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس امت پر اس کے دشمنوں کو اس قسم کا غلبہ وتسلط نہیں ہوگا جس سے وہ امت کے وجود کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔

لیکن تیسری دعا (أَلَّا يَلۡبِسَ هٰذِهِ الۡاُمَّةَ شِيَعاً) ''یعنی میری امت، گروہ بندی اور باہمی لڑائی سے محفوظ رہے''۔ کو اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمایا۔ اور اس معاملے میں امت کو اسباب و مسبباب کے فطری واجتماعی قانون کے تابع کر دیا ہے؛ اور اس معاملے میں امت پر کسی بھی قسم کا کوئی جبر یا خصوصی معاملہ اللہ تعالیٰ کا نہیں ہے بلکہ امت کو اس معاملہ میں آزاد وبا اختیار رکھا گیا ہے کہ وہ اگر چاہے تو اللہ، رسول اور قرآن کی تعلیمات اور ہدایات پر عمل کر کے، اپنی صفوں میں اخوت واتحاد پیدا کر کے امت واحدہ بن جائے۔ اور اللہ کی نصرت و مدد کی مستحق ہو کر، اپنے دشمنوں کے مقابلے میں عزت وسربلندی حاصل کرلے۔ اور چاہے تو شیطان ونفس کی پیروی کر کے تفرقہ واختلاف کا شکار ہو جائے اور اپنے اوپر اپنے دشمنوں کو مسلط ہونے کا موقعہ خود فراہم کر دے۔ جو امت کے باہمی تفرقہ سے فائدہ اٹھائیں اور امت کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ تباہ وبرباد کروائیں۔

دوسرے، ان احادیث کا اگر وہ مفہوم مراد لیا جائے کہ امت میں تفرقہ واختلاف، تقدیر الٰہی کا اٹل فیصلہ اور ناگزیر ولازمی چیز ہے تو اللہ اور رسولؐ کے وہ احکامات جو امت کو باہم متحد اور اخوت کے ساتھ رہنے کا حکم دیتے ہیں اور وہ جو امت کو باہمی اختلاف وتفرقہ سے منع کرتے ہیں، سب بیکار اور عبث ہو جائیں گے اور اللہ ورسولؐ کے ان احکامات کا کوئی معنیٰ اور جواز باقی نہیں رہے گا جسے ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ کیوں کہ امت کو اللہ تعالیٰ نے جس اخوت واتحاد کا حکم دیا ہے وہ ناقابل عمل ہے۔ اور جس اختلاف وافتراق سے بچنے کا حکم دیا ہے، اس سے بچنا محال وناممکن ہے۔

ان وجوہ سے ان احادیث سے وہ استدلال، باطل وغلط ہو جاتا ہے کہ امت میں تفرقہ لازمی و ناگزیر چیز ہے۔ کیوں کہ یہ بات اللہ ورسولؐ کے دوسرے احکامات سے متصادم اور اس کے خلاف ہے کہ اللہ ورسولؐ کے مختلف احکام میں باہم موافقت ومطابقت ہوتی ہے، تصادم ومخالفت نہیں ہوتی جس پر قرآن وحدیث گواہ ہیں:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط وَلَوْكَانَ مِنَ عِنْدِغَيْرِاللّٰهِ لَوَجَدُوْفِيْهِ اخْتِلَافاًكَثِيْرًا ● (النساء۔۸۲)

’’کیا یہ (کفار ومنافقین) قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت زیادہ تضاد واختلاف ہوتا۔‘‘

نبی کریمؐ نے کچھ لوگوں کو باہم بحث کے دوران، قرآن کی ایک آیت سے دوسری آیت کے خلاف استدلال کرتے ہوئے سنا تو فرمایا کہ:

إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِهٰذا، ضَرَبُوا كِتَابَ اللّٰهِ بَعْضَهٗ بِبَعضٍ وَإِنَّمَا اُنْزِل كِتَابَ اللّٰهِ لِيَصدُقَ بَعْضَهٗ بَعْضاً، فَلَا تَكْذِبُوهُ بَعْضَهٗ بِبَعضٍ۔ (مسند احمد)

’’اللہ کی کتاب کے ایک حصے سے دوسرے حصے کے خلاف استدلال کرنے کی وجہ سے ہی تم سے پہلے کی امتیں ہلاک ہو چکی ہیں؛ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی کتاب کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تصدیق کے لئے نازل ہوا ہے۔ اس لئے تم کتاب کے ایک حصے سے دوسرے حصے کی تکذیب نہ کرو۔‘‘

مزید یہ ہے کہ وہ احادیث جن میں امت کے تفرقہ واختلاف کی خبر بیان ہوئی ہے، وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں؛ ان میں صرف فرقوں کی تعداد بیان ہوئی ہے کہ ’’یہود اور نصاریٰ اکہتر یا بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔‘‘ (حدیث) اس کو ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا

ہے۔ لیکن ان احادیث میں یہ اضافہ نہیں ہے کہ (اَلْفِرَقُ كُلُّهَا فِيْ النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةٌ) ایک کے علاوہ تمام فرقے جہنمی ہیں۔

ان احادیث کو ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے۔ ابن حبان اور حاکم نے بھی صحیح کہا ہے لیکن حافظ ذہبیؒ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ (صَدُوقٌ لَهٗ اَوْهَامٌ) یہ سچے ہیں لیکن وہ وہم کے شکار تھے۔

دوسری احادیث جن میں یہ اضافہ ہے (اَلْفِرَقُ كُلُّهَا فِي النَّارِاِلَّا وَاحِدَة) اس کے راوی ابن عمرؓ، معاویہؓ اور انسؓ ہیں اور ان کی ساری اسناد ضعیف ہیں، کچھ محدثین نے بعض اسناد کو بعض کے ساتھ ملا کر اسناد کو قوی کہا ہے۔

دراصل ضعیف، موضوع اور صحیح کا معرکہ، محدثین کے درمیان اسی اضافہ پر ہے کیونکہ اس اضافہ نے امت کے ایک گروہ کے علاوہ، باقی امت کو جہنمی بنا دیا۔ اور اس اضافے سے استدلال کر کے امت کا ہر گروہ خود کو ناجی اور دوسروں کو جہنمی قرار دینے لگا۔ اس اضافے نے امت کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اور یہ پوری امت کے افتراق کا سبب بنا ہے۔ جس کی وجہ سے امت کے اندر ضعف اور کمزوری پیدا ہو گئی ہے اور امت اپنے دشمنوں کے لئے نرم چارہ بن گئی ہے اور انہوں نے جیسے چاہا اُسے تباہ و برباد کیا ہے۔

علامہ ابن الوزیرؒ (ت۔ ۸۴۰ھ) پوری امت کو اس حدیث کے اضافے سے خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم اس سے دھوکے میں مبتلا نہ ہو اور اس فریب میں نہ آؤ کہ تمہارے علاوہ سب جہنمی ہیں کیوں کہ یہ اضافہ فاسد ہے، قاعدے کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے اور خفیہ سازش کا نتیجہ ہے۔

علامہ ابن حزمؒ اس اضافہ کو موضوع (گھڑا ہوا) کہتے ہیں۔ اور دونوں احادیث کے بقیہ حصوں کے بارے میں ابن حزمؒ کہتے ہیں کہ هَذَانِ حَدِيثَانِ لَايَصِحَانِ اَصْلاً مِن طَرِيْقِ الاسناد۔ یعنی یہ دونوں حدیثیں اسناد کے طریقوں کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں۔

(اَلْمِلَلُ وَالنِّحَلُ، تحقیق ڈاکٹر ابراہیم نصر، ج:۳ ص ۲۹۲)

ابن ماجہؒ کہتے ہیں کہ: لیسَ فیھا شیءٍ علیٰ شرط الصحیح ۔یہ حدیث صحیح کی شرائط پر پوری نہیں اترتی۔اسی وجہ سے بخاریؒ و مسلمؒ نے ان کو نقل نہیں کیا ہے۔(العواصم والقواصم: ابن الوزیر)

لیکن حافظ ابن حجرؒ نے کثرت طرق کی وجہ سے ان احادیث کو حسن کہا ہے اور ابن تیمیہؒ نے کثرت طرق کی وجہ سے صحیح کہا ہے۔

قدیم و جدید، ہر زمانے میں ایسے علمائے حدیث موجود رہے ہیں جن میں بعض نے سند کے اعتبار سے اور بعض نے متن و معنیٰ کے اعتبار سے ان احادیث کو رد کیا ہے۔متن کے اعتبار سے رد کرنے والوں کا استدلال ملاحظہ ہو:

’’اس حدیث میں اشکال کی وجہ یہ ہے کہ اس امت کو جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے برپا کیا ہے اور قیامت تک کے انسانوں کے سامنے اپنے دین کی شہادت کے لئے اسے انبیاء کا قائم مقام بنایا ہے، جسے خیر امت کا لقب عطا فرمایا ہے، کیا وہ تفرقہ و اختلاف میں یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر اور بری ہو جائے گی؟ اور فرقوں کی تعداد کے لحاظ سے بھی زیادہ ہو جائے گی؟‘‘

’’جب کہ یہود و نصاریٰ کے باہمی بغض، عداوت، تفرقہ اور اختلاف کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ان کے درمیان بغض و عداوت کی بنیاد ڈال دی اور ہمیشہ کے لئے انہیں فرقوں و گروہوں میں بانٹ دیا کیوں کہ انہوں نے میرے دین اور کتاب ہدایت کو فراموش کر دیا تھا اور اس کے خلاف ظلم و سرکشی کا معاملہ کرتے تھے، اس کے ایک حصے پر عمل کرتے تو دوسرے کو چھوڑ دیتے تھے۔چنانچہ یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرمایا:

وَمِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓی اَخَذْنَا مِیْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ؕ (المائدۃ۔۱۴)

’’اور اسی طرح سے ہم نے ان لوگوں سے پختہ عہد لیا تھا جو کہتے تھے کہ ہم نصاریٰ ہیں مگر جس ہدایت کی یاد دہانی ان کو کرائی گئی تھی اس کے ایک بڑے حصے کو انہوں نے فراموش کر دیا تو آخر کار (اس کی سزا میں) ہم نے ان

کے درمیان قیامت تک کے لئے دشمنی اور آپس میں بغض و عناد کا بیج بو دیا۔‘‘

وَلَیَزِیْدَنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْیَانًا وَّكُفْرًا ؕ وَاَلْقَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ؕ (المائدۃ۔۶۴)

’’حقیقت یہ ہے کہ جو کلام تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے، وہ ان میں سے اکثر کی سرکشی و باطل پرستی میں الٹے اضافہ کا موجب بن گیا ہے اور (اس کی سزا میں) ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے عداوت و دشمنی کی بنا ڈال دی۔‘‘

’’جب کہ امت مسلمہ کے لئے اس طرح کی کوئی بات قرآن میں نہیں بیان ہوئی کہ ہم اسے تفرقہ میں مبتلا کر دیں گے بلکہ اس کے برعکس، قرآن نے امت مسلمہ کو خبردار کیا ہے تم یہود و نصاریٰ کی طرح باہمی بغض و عناد اور تفرقہ کا شکار نہ ہونا۔‘‘

’’پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ یہ حدیث امت کے ایک فرقے کے علاوہ باقی سارے فرقوں کو جہنمی قرار دیتی ہے جب کہ صحیح احادیث میں اس امت کی فضیلت یہ بیان ہوئی ہے کہ یہ وہ امت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا ہے اور جنت کی تین چوتھائی یا نصف آبادی اس امت مرحومہ پر مشتمل ہوگی۔‘‘

’’اور آخری بات یہ ہے کہ اس حدیث میں اُمَّتی کا لفظ آیا ہے جس کے معنیٰ ہیں ’’میری امت‘‘ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ سارے فرقے اپنے بگاڑ و کمزوری کے باوجود امت مسلمہ کے جسم کا حصہ ہوں گے۔جنہیں ملت کے جسم سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔اور اگر ان کے بگاڑ کی وجہ سے ان کو آگ میں ڈالا گیا تو وہ کفار کی طرح دائمی داخلہ نہ ہوگا بلکہ وہ گناہگار موحدین اور مومنین کی طرح کا ہوگا۔‘‘

اب تک کی گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ امت کے درمیان اتحاد و اتفاق اور باہمی تعاون کو

فروغ دینا اور حتی الامکان امت کو اختلاف وافتراق سے بچانا، امت کے ہر فرد پر لازم وفرض ہے اور امت کا باہمی افتراق تقدیر الٰہی کا اٹل فیصلہ اور ناگزیر چیز نہیں ہے کیوں کہ اس دنیا میں آزمائش کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے، ہر انسان کو ارادے وعمل کے لئے آزاد و با اختیار بنایا ہے اور کسی بھی شخص یا قوم کو کسی بھلے یا بُرے عمل کیلئے مجبور نہیں کیا گیا ہے۔ ہر فرد اور قوم اپنی مرضی سے چاہے تو اللہ و رسولؐ کے احکام کی اتباع کرے اور اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے، بنیان مرصوص اور امت واحدہ بن جائے۔ اور چاہے تو اختیار و آزادی کا غلط فائدہ اٹھا کر اللہ اور رسولؐ کے احکام کو پس پشت ڈال دے، اور نفس وشیطان کی اتباع کر کے اختلاف وتفرقہ کا شکار ہو جائے۔

دین میں اتحاد واختلاف کے دائرے کا علم وفہم :۔

امت اس وقت تک تفرقہ سے نہیں بچ سکتی اور اتحاد کی حامل نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ درج ذیل علمی وفکری اوصاف کو رہنما اصول کی حیثیت سے اختیار نہیں کر لیتی اور پورے اخلاص کے ساتھ ان پر عمل پیرا نہیں ہوتی۔

(۱) دین میں اتحاد واختلاف کے دائرے کا فہم (۲) اختلافی امور میں اعتدال کی پیروی، اور تشدد سے اجتناب (۳) محکمات پر توجہ وعمل، اور متشابہات سے اجتناب (۴) اجتہادی امور میں باہمی مخالفت کی شدت سے اجتناب (۵) فروعی امور میں علماء سلف کے اختلاف کا علم وفہم (٦) الفاظ واصطلاحات کے مفہوم کی تحدید ووضاحت (۷) گروہی مفادات پر امت مسلمہ کے مفاد کو ترجیح (۸) باہم متفق علیہ امور میں اشتراک وتعاون (۹) اختلافی امور ومسائل میں رواداری، نرمی وفیاضی (۱۰) کلمہ گو کی تکفیر سے اجتناب۔

اللہ نے اس دنیا میں اپنی مخلوقات کو اختلاف میں وحدت کے قانون فطرت پر پیدا کیا ہے اور اس کائنات میں اس کی کوئی ایک مخلوق بھی ایسی نہیں ہے جو ہر چیز میں بالکل متحد ومتفق ہو بلکہ اس

دنیا میں اس کی ہر مخلوق ، اختلاف کے ساتھ ساتھ اتحاد کا حسین و دلکش منظر بھی پیش کر رہی ہے۔ایک طرف اگر ہر مخلوق اپنی تفصیلات و جزئیات میں باہم مختلف اور الگ الگ ہے تو وہیں دوسری طرف وہ بنیاد، اصول اور کلیات میں باہم متحد اور متفق بھی ہے۔

مثلاً آم کے پھل کو لیجئے۔ایک طرف اگر آم کا ہر پھل اپنی جزوی اور تفصیلی خصوصیات میں ایک دوسرے سے بالکل منفرد اور الگ ہے، اپنے حجم، ذائقے، شکل وصورت اور رنگ وبو میں ہر آم دوسرے آم سے بالکل منفرد اور مختلف ہے، تو دوسری طرف وہ سارے آم اپنی بنیادی خصوصیات اور شکل میں اس طرح متحد ہیں کہ دور سے اور سرسری نظر سے دیکھنے والا ان کو آم ہی کہتا ہے۔اسی طرح انسان جس کی ہدایت کے لئے، دین اسلام آیا ہے۔وہ اپنی بنیادی خصوصیات، ڈھانچے اور شکل میں باہم متحد ومتفق ہونے کے ساتھ ساتھ، فروعی وجزوی تفصیلات میں دوسرے انسان سے بالکل مختلف اور الگ بھی ہے خواہ ان کی نسل، جنس اور رنگ ایک ہی ہو۔دنیا میں دو ایسے انسانوں کا وجود ناممکنات میں سے ہے جو اپنی تمام جزوی وفروعی تفصیلات میں بھی باہم متحد اور مشترک ہوں۔لیکن اس اختلاف کے باوجود، سب انسان ہی ہیں کیوں کہ ہر انسان اپنی بنیادی خصوصیات اور اصول میں ایک اور متحد ہے۔

یہ اللہ کی مقرر کردہ فطرت ہے جس پر اس نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے، اور اللہ کی اس فطری تخلیق میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے:

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ط لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط (الروم ۔ ۳۰)

’’قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی۔‘‘

انسانوں کی اس فطرت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے دین کے اعمال واحکام کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ دین کا ایک حصہ، بنیادی، اصولی اور قطعی ہے: اس دائرے میں کسی قسم کا کوئی بھی

اختلاف حرام اور ممنوع ہے جن میں عقائد، اصول، فرائض، حدود، حلال وحرام اور وہ کلی وقطعی قواعد آتے ہیں جو دین کی اصل اور بنیاد ہیں، جن میں اختلاف وافتراق ممنوع، حرام اور گمراہی ہے: اور جن میں اختلاف دین میں افتراق کے ہم معنیٰ ہیں۔ جو روایت اور درایت۔ دونوں اعتبار سے واضح اور قطعی طور پر نص صریح سے ثابت ہیں، جنہیں قرآن میں ''العلم''، ''بینات'' اور ''محکمات'' کہا گیا ہے۔ جن میں زمانے اور حالات کی تبدیلی سے کسی قسم کی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ تبدیلی تو درکنار، اس کے امکان کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو اپنے ثبوت کے لئے مجتہدین کے اجتہاد کے بھی محتاج نہیں ہیں اور نہ جن میں اجتہاد کی کوئی گنجائش ہے۔ جن پر ایمان لانا فرض ہے۔ جو مؤمن اور کافر کے درمیان حدِّ فاصل ہیں اور ان کا انکار کرنے والا کافر، اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ مثلاً عقائد میں، توحید، رسالت، آخرت، حضورؐ پر نزول قرآن، ختم نبوت، زندگی بعد موت، آخرت میں اعمال کی جزا وسزا اور عصمتِ انبیاء وغیرہ وغیرہ۔

ثانیاً: وہ عملی احکام جو فرض ہیں، جن کا واضح اور قطعی حکم شریعت میں آیا ہے مثلاً: نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی فرضیت دن رات میں پانچ بار نمازوں کا قیام، ان کی رکعتوں کی تعداد، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی معروف شرائط متعینہ اوقات میں ادائیگی اور دیگر احکام مثلاً قتل ناحق، زنا، تہمت اور باطل طریقے سے اموال کا کھانا وغیرہ وغیرہ۔

ثالثاً: وہ کلی اور اصولی قاعدے جو صریح اور قطعی نصوص سے ماخوذ ہیں، جن میں کوئی تعارض نہیں ہے جنہیں شریعت نے اپنے احکام کے استنباط کی اساس اور بنیاد بنایا ہے۔ ان میں اختلاف جائز نہیں ہے۔ مثلاً: لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ (نہ تم کسی کو ایذا دو اور نہ تم کو ایذا دی جائے) یا وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط (اللہ نے تمہارے دین میں کوئی تنگی اور حرج نہیں رکھا ہے۔) وغیرہ وغیرہ۔

قرآن کی وہ ساری آیات جو امت مسلمہ کو تفرقہ واختلاف سے منع کرتی ہیں، اور اس پر گمراہی

اور جہنم کی وعید سناتی ہیں، جو یہود ونصاریٰ کی مثال اور حوالے سے امت کو خبردار کرتی ہیں کہ وہ علم اور بینات کے آنے کے بعد، باہم (ایک دوسرے پر ظلم وزیادتی کی وجہ سے) فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ وہ سب دین الٰہی کے بنیادی، اصولی اور قطعی احکام میں اختلاف سے متعلق ہیں، اور یہ دین کا وہ دائرہ ہے جس میں اختلاف وتفرقہ مذموم وممنوع ہے۔ قرآن کی درج ذیل آیات میں، دین کے اسی دائرے کے اختلاف وافتراق سے منع کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ م بَعْدِمَا جَاءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ ط وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ● (آل عمران آیت۔۱۰۵)

''اور ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا جو تفرقہ میں پڑ گئے اور بینات آنے کے بعد باہم اختلاف کیا، انہیں کے لئے عذاب عظیم ہے۔''

● وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ ۔ (الانفال۔۴۶)

''باہم تنازعہ نہ کرو کہ تم کمزور پڑ جاؤ اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے۔''

● اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعاً لَّسْتَ مِنْهُمْ فِىْ شَىْءٍ ط (الانعام۔ ۱۶۰)

''بلاشبہ وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین میں تفریق پیدا کی، اور فرقوں میں بٹ گئے، اے نبیؐ! آپ کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔''

● وَمَا تَفَرَّقُوْا اِلَّا مِنْ م بَعْدِمَا جَآءَ هُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا م بَيْنَهُمْ ط (الشوریٰ۔۱۴)

''علم آجانے کے بعد ہی وہ لوگ ظلم وزیادتی کی وجہ سے فرقوں وگروہوں میں تقسیم ہوئے۔''

حضورؐ نے اسی قسم کے اختلاف سے متعلق یہ وعید سنائی ہے:

لَا تَخْتَلِفُوْا، فَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ إِخْتَلَفُوْا، فَهَلَكُوْا۔

''باہم اختلاف نہ کرو۔ کیونکہ تم سے پہلے جنہوں نے اختلاف کیا، وہ ہلاک ہو گئے۔''

دین میں دوسری نوعیت کے احکام واعمال وہ ہیں جن میں اختلاف کا واقع ہونا فطری ولازمی ہے کیوں کہ وہ اپنے معنیٰ ومفہوم کے اعتبار سے شریعت میں واضح اور قطعی شکل میں نہیں آئے ہیں۔ وہ دلائل اور اشاروں سے ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں علمی وعقلی تفاوت، عرف ومصالح کے اختلافات، روایتوں کے باہمی تعارض کی وجہ سے فہم، نقطہ نظر اور ترجیح کا اختلاف ہوتا ہے۔ دین میں اس طرح کے اجتہادی احکام کی تفصیلات وجزئیات کے تعین میں اختلاف کا ہونا فطری بات ہے۔ امت مسلمہ کے تمام اہل علم کو اس قسم کے امور میں ایک رائے وموقف پر جمع نہیں کیا جا سکتا، اور اس نوع کے احکام میں حدود کے اندر، اختلاف کا ہونا، دین اسلام میں ناپسندیدہ بھی نہیں ہے۔ جب تک باہم اختلاف کرنے والے اپنی بحث وتحقیق میں مخلص اور وسیع الظرف ہوں اور ان کی سعی وجہد کا مقصد، رضائے الٰہی کے حصول کے لئے حق کی دریافت اور اس پر عمل ہو تو اجتہادی مسائل اور فروعی امور میں اس طرح کے اختلافات سے غور وفکر اور عمل کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ امت کی اجتماعی زندگی سے حرج، تنگی اور مشکلات کا خاتمہ ہوتا ہے اور امت کی انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں کی تکمیل میں آسانی وسہولت پیدا ہوتی ہے۔

صحابہ کرامؓ اور تابعین کے درمیان جزوی وفروعی احکام ومسائل میں باہم اختلافات ہوئے۔ ایک نے دوسرے کی رائے واجتہاد کے مقابلہ میں دلائل وبراہین سے اپنے موقف کی حقانیت ثابت کی اور اپنی رائے واجتہاد کا احسن طریقے سے دفاع بھی کیا، حکمت اور موعظۂ حسنہ کے ذریعہ وہ اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت بھی دیتے رہے۔ لیکن جزئیات میں ان کا یہ اختلاف، ان کے درمیان نفرت وعداوت کا سبب نہ بنا: اور نہ کبھی یہ سنا گیا کہ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو بدنیت کہا ہو، یا کسی قسم کا کوئی بہتان لگایا ہو۔ نہ انہوں نے اپنی اختلافی رایوں اور اجتہادات کو قواعد ایمان اور اصول شریعت کا درجہ دیا۔ اور نہ اپنی اجتہادی رائے سے اختلاف کرنے والوں کو انہوں نے کافر یا گنہگار قرار دیا۔ وہ صحیح معنوں میں (اشِدّاءُ علی الکُفّارِ

رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ) ''کفار پر نہایت سخت اور آپس میں نہایت مہربان'' کی حقیقی تفسیر تھے کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ دین کے کس دائرے میں اختلاف، فتنہ ہے اور کس دائرے میں یہ ایک ضرورت، وسعت اور رحمت ہے! انہوں نے امت کی وحدت، عزت، سربلندی اور فتنوں کے سدباب کے لئے حضور کی سنت اور طریقے کو پوری قوت کے ساتھ پکڑ رکھا تھا، جس کی وجہ سے انہیں اس دنیا میں بھی قوت، عزت اور سربلندی حاصل تھی۔

لیکن آج امت مسلمہ، صحابہؓ اور سلفؒ کے اس طریقے سے منحرف ہوگئی ہے اور اپنے فروعی وجزوی اختلافات میں ایسے جمود، عصبیت اور گروہ بندی کا شکار ہوگئی ہے جس میں نہ تو باہمی گفت وشنید اور افہام وتفہیم کے لئے کوئی جگہ اور موقع ہے اور نہ عقل، دلیل اور برہان ہی کی کوئی قدر وقیمت! امت کے درمیان جزوی ومسلکی اختلافات آج اصول دین کے قائم مقام بن گئے ہیں جن کی وجہ سے امت کے مختلف گروہوں کے درمیان نفرت، دشمنی، سوءظن، تہمت اور طعنوں کا علی الاعلان تبادلہ ہو رہا ہے بلکہ بعض اوقات باہم قتل اور غارت گری کی نوبت بھی آجاتی ہے جس کی بنا پر اس کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی ہے۔ دشمنوں کے دل سے اس کی ہیبت اور رعب نکل گیا ہے اور امت اپنے دشمنوں سے مغلوب ہوکر آج سیلاب کے جھاگ کی مانند بالکل بے وزن اور بے وقعت ہوچکی ہے۔

نہایت افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ دین کے جس دائرے میں اختلاف کو آپؐ نے امت کیلئے رحمت قرار دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی امت پر اپنی رحمت کے پیش نظر، صرف بنیادی اور اصولی مسائل میں حلال وحرام کے احکام عطا فرمائے تا کہ حالات وزمانہ کی تبدیلی سے، دین پر عمل کرنے میں امت پر کسی قسم کا کوئی حرج یا تنگی باقی نہ رہے۔ اور امت ہر زمانے اور ہر طرح کے حالات میں ان اصولوں کی روشنی میں، حدود کے اندر رہ کر عمل کے لئے قیاس واجتہاد کے ذریعہ فروعی وجزوی تفصیلات طے کرتی رہے۔ افسوس ہے کہ آج امت کے درمیان یہ اختلافات باہمی

نفرت، عداوت اور فتنہ وفساد کا سبب بن گئے ہیں۔

امت جب تک فروعی اور اجتہادی امور و مسائل میں تفرقہ واختلاف کے اس فتنہ سے نجات نہیں حاصل کرتی، دلائل و براہین پر مبنی اجتہادی وفروعی اختلاف کے لئے وسعت قلب کا مظاہرہ نہیں کرتی، اس وقت تک ان خرابیوں کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں ان دونوں نوعیّتوں اور قسموں کے احکام کے نزول کی حکمت، مقصد اور ضرورت کیا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر اسلامی شریعت میں احکام ایک ہی نمونے اور طریقے پر نازل ہوئے ہوتے تو انسانوں کے معاملات میں اصلاح کے بجائے فساد برپا ہوجاتا۔ مثلاً عقائد، دین کے بنیادی اصول، فرائض حدود اور حلال وحرام یا عبادات کی مخصوص شکلیں، ان کے اوقات اور ان کی مخصوص تعداد ومقدار یا معاملات کے شعبوں کے وہ اصول جن پر وہ قائم ہیں، اور جن کو شریعت نے حقیقتِ واقعی کا نام دیا ہے، ان کو انسانوں کی عقلوں، فہموں اور اندازوں کے حوالے کرنا۔ گویا شر وفساد اور افتراق وانتشار کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا۔ اس لئے انسانوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے تقاضے کے طور پر اور ان کو ان دائروں ومیدانوں میں اختلاف و افتراق سے محفوظ کرنے کیلئے، مستقل، دائمی اور ثابت احکام دئے۔ کیوں کہ ہر انسان اس دائرے کی ضرورتوں اور حکمتوں کو اپنی محدود عقل وعلم سے تفصیلی طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ اور نہ ہی ان میں حالات وزمانہ کے بدل جانے سے کسی قسم کا کوئی تغیر یا تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یہ ہمیشہ ایک حالت پر باقی رہنے والے مستقل اور دائمی حقائق ہیں۔

اس کے برعکس، فروعیات وجزعیات، خواہ وہ نظری ہوں یا عملی۔ ان میں اختلاف رائے و نظر مضر یا نقصان دہ نہیں ہے جیسا کہ اصول وثوابت میں ہے: بلکہ اگر اس دائرے میں وحدت و یکسانیت پیدا کردی جائے تو لوگوں کے معاملات میں حرج، خرابی اور فساد پیدا ہوجائے گا۔

زمانے اور حالات کے بدل جانے سے بھی اور معاملات کی گوناگوں اور لاتعداد شکلوں کی وجہ سے بھی، شریعت اسلامیہ اور انسانی ضرورتوں اور مصلحتوں میں ٹکراؤ وتصادم پیدا ہوجائے گا۔ اس لئے معاملات کے جزوی وفروعی پہلوؤں میں اجتہاد صرف مطلوب ومحمود ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے، کیونکہ فروعی معاملات میں انسان کی ہر وقت بدلتی ہوئی ضروریات ومصالح کی رعایت ضروری ہے تاکہ دین پر عمل میں لوگوں کے لئے حرج ختم اور آسانی پیدا ہو۔ اور یہ کام بروقت اجتہاد کے بغیر ناممکن ہے۔

اسی مقصد کے لئے اللہ کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ وہ فروعی معاملات میں شرعی اصولوں اور حدود کی روشنی میں اجتہاد کا دروازہ کھول دے، جو مشکل ترین صورتوں، قضیوں اور مسائل میں انسانوں کی ہمیشہ رہنمائی کرے، اور ہر زمانے اور ہر طرح کے حالات میں انسانی ضروریات اور مصالح کی تکمیل ہوتی رہے۔

اس لئے جو لوگ فروعی اور اجتہادی امور ومسائل میں پوری امت کو ایک طریقہ اور رائے پر جمع ومتحد کرنا چاہتے ہیں، وہ ایسا کام کررہے ہیں جو ناممکن ہے کیوں کہ فروعی اور اجتہادی امور میں اختلاف فطری امر ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہر زمانے اور ہر طرح کے حالات میں سارے انسانوں کو ایک رائے ومسلک پر قائم رکھنا چاہتا تو دین میں اس طرح کے احکام نازل کرتا جن میں فہم یا تفسیر کے اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی۔

لیکن ہم دیکھتے ہے کہ دین میں کچھ محکمات ہیں جو دین کی اصل اور بنیاد ہیں اور اپنے مفہوم و دلالت میں بالکل صاف، واضح اور قطعی ہیں۔ اور کچھ متشابہات ہیں جو اپنے مفہوم اور دلالت میں غیر واضح اور ظنی ہیں۔ ہر زبان کی طرح عربی زبان میں بھی کچھ الفاظ ایسے ہیں جو ایک سے زائد معنیٰ پر دلالت کرتے ہیں۔ ایک ہی لفظ ہے لیکن وہ کہیں اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو دوسرے مقام پر وہی لفظ مجازی معنوں میں آتا ہے۔ ایک جگہ خاص معنیٰ مراد ہوتے ہیں تو دوسری

جگہ عام۔ایک جگہ ایک لفظ مطلق کے مفہوم میں ہے تو دوسری جگہ مقید کے معنیٰ میں ہے۔ان سب میں کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں جن کی دلالت واضح اور قطعی ہے تو کچھ کی محتمل اور ظنی۔ایک لفظ کے معنیٰ ایک عالم کے نزدیک مقبول ہے تو دوسرے کے نزدیک نامقبول۔مثلاً: آیت تیمّم میں اَوْ لَا مَستُمُ النِّسَاءَ سے مراد آیا مرد کا عورت کو صرف چھونا ہے یا یہ ہم بستری کا اشارہ و کنایہ ہے۔جیسا کہ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں۔یا پھر فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْداً طَیِّباً سے مراد صرف مٹی ہے، یا وہ چیز ہے جو زمین کی جنس سے ہو۔مثلاً طلاق کی عدت ثَلَاثَۃَ قُرُوْءٍ کو لے لیجئے۔تین قُرُوء سے مراد تین حیض ہے یا تین طہر (پاکی)؟ کیونکہ عربی لغت میں قـــروء کا لفظ حیض اور طہر دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک دوسرے سے الگ اور مختلف صلاحیت دے کر پیدا کیا ہے۔ہر انسان اپنی صورت، چہرہ، آواز اور دیگر جسمانی اعضاء میں، جس طرح بالکل منفرد اور الگ ہوتا ہے اسی طرح اس کے غور و فکر کا اسلوب عقل وفہم، ذوق اور میلان طبع بھی بالکل منفرد اور الگ ہوتا ہے۔انسان اپنی اسی انفرادیت کی وجہ سے، اشیاء، اشخاص اور اعمال کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف اور الگ مؤقف اختیار کرتا ہے۔

اس لئے جس طرح سارے انسانوں کو زندگی کے جملہ معاملات میں تمام اختلافات کو مٹا کر ایک قالب میں ڈھال دینا ممکن نہیں ہے بالکل اسی طرح اختلافی و اجتہادی امور میں سب کو ایک رائے وموقف پر متحد کر دینا بھی ناممکن ہے کیوں کہ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔پھر ایک ضروری نکتہ یہ بھی ہے کہ جس طرح شکل وصورت، عقل وفہم اور ذوق ومیلان کے درمیان، انسانوں کا اختلاف تنوع اور توسع کا اختلاف ہے، تضاد اور ٹکراؤ کا نہیں۔ بالکل اسی طرح فروعی و جزوی امور میں اجتہادی اختلاف دین کے توسع کا اختلاف ہے۔دین کا اختلاف نہیں ہے ۔جس طرح انسانوں میں تنوع کا اختلاف انسانی ثروت

(Asset) کے مانند ہے جو ہمیشہ انسانوں کی فلاح و بہبود اور اس کی ترقی کا ذریعہ بنتا ہے: بالکل اسی طرح فروعی و جزوی امور کا اجتہادی اختلاف بھی دین اسلام کی ثروت، قوت اور اللہ کی حکمت ہے۔اللہ کی اسی حکمت و رحمت نے دین اسلام کو دائمی و ابدی دین بنایا ہے، اور یہی وہ قوت اور ہتھیار ہے جس سے زمانہ و حالات کے پیدا کردہ نت نئے مسائل اور چیلنجوں کا مقابلہ اسلام ہمیشہ کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہے گا۔

ایک اور بات، کہ انسانوں میں کچھ کی طبیعت تشدد اور سختی کی طرف مائل ہوتی ہے تو کچھ کی آسانی اور سہولت کی طرف۔ان میں کچھ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ظاہری نص سے مسائل اخذ کرتے ہیں، اور کچھ وہ بھی ہیں جن کی نظر نص کی روح اور اسپرٹ پر ہوتی ہے۔کچھ لوگ وسیع الظرف اور کشادہ دل ہوتے ہیں تو کچھ تنگ دل اور سخت مزاج! حقیقی اور نفسیاتی اعتبار انسانوں کی طبیعت اور مزاج کے اس اختلاف کا اثر فطری طور پر ان کے فیصلوں اور فتووں پر بھی پڑتا ہے خواہ یہ فقہی احکام کا معاملہ ہو یا سیاست کا! یا اس کا تعلق روزانہ کی انسانی زندگی کے معاملات و مسائل سے ہو۔انسانی طبائع کے اختلاف کی واضح مثال ہمیں دو جلیل القدر اصحابِ رسول حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور عبداللہ ابن عباسؓ کے مختلف اجتہادات اور موقفوں میں ملتی ہے۔

ابن عمرؓ نجاست کے ڈر سے خود کو چھوٹے بچوں سے دور رکھتے تھے کہ کہیں ان کی کوئی گندگی انہیں لگ نہ جائے۔لیکن ابن عباسؓ چھوٹے بچوں کو اپنے بدن سے چمٹا لیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کی خوشبو کتنی خوشگوار ہے۔

ابن عمرؓ کے نزدیک، عورت کا بدن چھونے سے مرد کا وضو ٹوٹ جاتا ہے جب کہ ابن عباسؓ کے نزدیک نہیں ٹوٹتا۔ابن عمرؓ حجر اسود کو بوسہ دینے کیلئے بھیڑ میں گھسنا پسند کرتے تھے خواہ وہ زخمی ہی کیوں نہ ہو جائیں۔لیکن ابن عباسؓ بھیڑ میں گھسنا ناپسند کرتے تھے اور کہتے تھے کہ نہ تم کسی کو ایذا دو اور نہ تمہیں ایذا دی جائے۔

جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں حضورؐ کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا فدیہ یا قتل کا مشورہ دینا۔ دونوں صحابیوں کی طبیعت کے فطری اختلاف پر دلالت کرتا ہے۔

طبیعتوں کے اختلاف کی واضح مثال ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے ان دو مختلف موقفوں میں ملتی ہے جو بچھڑے کی پوجا کرنے کے موقعے پر، ان دونوں بزرگوں نے اختیار کیا تھا۔

اختلاف، انسان کی فطری عادت ہے۔ اسی لئے حدود کے اندر اختلاف، امت کے لئے رحمت اور وسعت کا مظہر ہے۔ انسانی زندگی کا ایک دائرہ ایسا ہے جس میں اللہ نے امت پر رحمت کے پیش نظر سکوت اختیار فرمایا ہے اور تفصیلی ہدایات نہیں دی ہیں۔ اسی دائرے میں، اصولوں کی روشنی میں، حدود کے اندر، قیاس واجتہاد کے ذریعہ نیا طریقہ نکالنا رحمت ہے۔ اور یہی وہ دائرہ ہے جس میں غلطی پر بھی ایک ثواب ہے جسے حضورؐ نے یوں بیان کیا ہے۔:

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالیٰ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَیعُوْھَا ، وَ حَدَّ حُدُوْداً فَلَا تَعْتَدُوْھَا، وَ حَرَّمَ اَشْیَاء فَلَا تَنْتَھِکُوْھَا، وَسَکَتَ عَنْ اَشْیَاءَ رَحْمَةٌ بِکُمْ بِغَیْرِ نِسْیَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْ اعَنْھَا

(الدار قطنی ، حسنه النووی ؒ)

”اللہ نے فرائض کو لازم کیا ہے تو انہیں ضائع نہ کرو۔ اور کچھ حدود مقرر فرمائے ہیں تو ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور جن چیزوں کو اس نے حرام ٹھہرایا ہے تو ان کی بے حرمتی نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے بارے میں اس نے جان بوجھ کر، بطورِ رحمت خاموشی اختیار فرمائی ہے تو ان میں کرید اور بحث نہ کرو۔“

ما اَحَلَّ اللّٰہُ فِی کِتَابِہٖ فَھُوَ حَلَالٌ ، وَمَا حَرَّمَ اللّٰہُ فَھُوَحَرَامٌ وَمَا سَکَتَ عَنہُ فَھُوَعَفُوٌ، فَاقْبَلُوْ ا، مِنَ اللّٰہِ عَافِیَتَہٗ، فَاِنَّ اللّٰہ لَمْ یَکُنْ یَنْسیٰ شَیْئًا۔ وَمَا کَانَ رَبُّکَ نَسِیّاً۔

(رواہ حاکم وصححه الذهبی ، و اسنادہ حسن و رجاله موثو قونَ)

”جو کچھ اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا ہے، وہ حلال ہے۔ اور جو حرام کیا ہے، وہ حرام ہے،

اور جن چیزوں کے بارے میں خاموش ہے، تو وہ معافی ہے: تو اللہ سے اس بخشش اور معافی کو قبول کرو۔ کیوں کہ اللہ یقیناً کسی بھی چیز کو نہیں بھولتا۔ پھر حضورؐ نے یہ آیت پڑھی کہ ” تیرے رب کو بھول لاحق نہیں ہوتی۔“

جن چیزوں کے بارے میں امت پر، رحمت کی غرض سے اللہ نے سکوت اختیار فرمایا ہے، عام طور پر اسی سکوت کے دائرے میں فقہاء امت کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔ ہر فقیہ ومجتہد نے سکوت کے خلا کو اپنے اپنے فقہی اصولوں وقاعدوں، قیاس، استحسان، استصلاح اور عرف کی روشنی میں پُر کیا ہے۔ پہلی حدیث میں جس چیز کو ”رحمت“ کہا گیا ہے، دوسری حدیث میں اسی کو ”معافی“ اور بخشش کہا گیا ہے۔ اور یہ دونوں امت پر اللہ کی رحمت، وسعت اور آسانی پر دلالت کررہی ہیں۔ یہی سکوت ومعافی کا دائرہ اجتہادی ہے۔ اور اجتہاد میں اختلاف ناگزیر ہے۔

بعض فروعی امور میں نص کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان امور اور دائروں میں اللہ نے اس امت کے لئے آسانی اور وسعت کا فیصلہ کیا ہے، امت پر اللہ کی طرف سے آسانی اس کی رحمت کی دلیل ہے جسے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اس طرح واضح کرتے ہیں:

”اگر صحابہ کرامؓ اجتہادی امور میں باہم اختلاف نہ کرتے تو میں اس بات سے ہرگز خوش نہ ہوتا۔ کیوں کہ اگر صحابہؓ باہم اختلاف نہ کرتے تو ہمارے لئے دین میں رخصت وآسانی نہ پیدا ہوتی۔“ (بیہقی)

یعنی صحابہ کرامؓ کے اختلافات نے اجتہادی وفروعی مسائل میں اختلاف کے حدود بھی ہم پر واضح کئے ہیں کہ وہ اختلاف کے باوجود باہم محبت کرنے والے بھائی کی طرح رہتے تھے۔

مدینہ منورہ میں تابعین کے زمانے کے ایک فقیہ قاسم بن محمدؒ سے، امام کے پیچھے، سری نماز میں قرأت فاتحہ کے بارے میں جب پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر تم پڑھتے ہو تو صحابہ کے اسوہ پر ہو: اور اگر نہیں پڑھتے ہو تب بھی تم صحابہؓ کے اسوہ پر ہو۔ یعنی دونوں طرح

کا عمل، صحابہ سے ثابت ہے۔

ابن عبدالبرالنمری، جامع بیان العلوم (ج:۲،ص:۸۰) میں رقم طراز ہیں:

''فتویٰ دینے والے مفتی، سکوت کے دائرے کی اشیاء کے بارے میں یہ کہہ کر لوگوں کو آزمائش میں ڈالتے ہیں کہ یہ حرام ہے اور یہ حلال ہے۔ حالانکہ سکوت کے دائرے کی کسی چیز کے حلال ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرا شخص جو اس کے حرام ہونے کا قائل ہے، وہ اس حرام کی وجہ سے ہلاک ہوا اور حرام کا قائل یہ نہ سمجھے کہ جو اس کے حلال کے قائل ہے، وہ اس کی وجہ سے گمراہ اور ہلاک ہوا۔''

اس کی وجہ یہ ہے کہ جن امور کے بارے میں شرع خاموش ہے، ان میں اجتہاد شرع کی ضرورت ہے، اور اجتہاد میں اختلاف رائے کا ہونا لازمی ہے، اور شریعت نے اجتہاد میں غلطی کر جانے والے کو بھی اجر سے محروم نہیں کیا ہے۔ اس لئے ہر مجتہد ایسے مسائل میں حرام یا حلال کی اپنی اجتہادی رائے پر عمل کرے گا۔ اور اس عمل کے لئے اس پر کوئی مواخذہ بھی نہ ہوگا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایک ہی چیز کے بارے میں حرام وحلال کے وہ سارے اقوال بیک وقت صحیح بھی ہیں۔ کیوں کہ دو متضاد اقوال میں صحیح تو ایک ہی ہوگا۔ لیکن ان سارے اقوال کے قائلین، اللہ کے نزدیک محمود و ماٴجور ہوں گے کیوں کہ مجتہد کو اس کی اجتہادی خطا پر بھی ایک ثواب ملتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے صحیح اجتہاد کرنے پر اسے دہرا ثواب ملتا ہے۔

اشیائے مسکوتہ کے دائرے کا یہی اجتہاد ہے جس کے اختلاف کو حضورؐ نے اللہ کی رحمت، وسعت اور معافی کا نام دیا ہے اور ہر زمانہ کے فقہاء نے بھی اس دائرے کے اجتہادی اختلافات کو رحمت و وسعت لکھا ہے یہاں تک کہ بعد کے فقہاء نے (رحمة الأمة باختلاف الأئمة) ''ائمہ کا اختلاف امت کیلئے رحمت ہے'' کے عنوان سے کتابیں بھی لکھی ہیں۔ چنانچہ علامہ الشیخ مرعی الحنبلیؒ (فی تنویر مصائر المقلدین) میں لکھتے ہیں کہ امت مسلمہ میں مسلکوں کا یہ

اختلاف امت کیلئے بڑی رحمت اور عظیم فضیلت ہے۔ اس کا صحیح شعور و ادراک علماء ہی کر سکتے ہیں، اور جہلاء اس راز کے ادراک سے محروم رہتے ہیں۔ پس امت کا یہ اختلاف، امت کی خصوصیت ہے، اور سہل و آسان شریعت کی وسعت ہے۔ (عمدۃ التحقیق البانی، ص:۳۷)

یہاں پر اس بحث میں ہم ایک بات کا مزید اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ فروعی معاملات میں اختلاف ایک رخ سے ضرورت ہے تو دوسری جانب سے رحمت۔ اور تیسرے پہلو سے سرمایہ بحث ونظر کی ثروت بھی ہے۔ کیوں کہ اجتہادی رایوں کے اختلاف سے تشریعی وفقہی سرمایہ میں ترقی و توسیع ہوتی رہتی ہے اس لئے کہ ہر اختلافی رائے کی پشت پر کچھ نہ کچھ شرعی دلائل ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر ایک عاقل و بالغ نظر فقیہ، اجتہاد، استنباط، قیاس، موازنہ اور ترجیح کے ذریعہ ان کو فقہی اصولوں سے جوڑتا اور قواعد کلیہ پر تولتا رہتا ہے اور ان سے نئے فروع اور مسائل کا استنباط کرتا رہتا ہے۔ اس طرح یہ سارے اجتہادی اقوال، ایک ایسا علمی خزانہ بن جاتے ہیں جن کی قدر و قیمت کا صحیح اعتراف اندازہ اہل علم وفکر کے علاوہ کسی اور کو نہیں ہوسکتا۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رابطہ عالم اسلامی کی "مجلس المجمع الفقهي الاسلامي" کی اس قرارداد کا خلاصہ نقل کر دیا جائے جو اس نے اپنے دسویں اجلاس منعقدہ مکہ، بتاریخ ۱۷/اکتوبر ۱۹۸۷ء کو ''امت کے فقہی مسالک کے درمیان اختلاف کی حیثیت'' کے عنوان پر منظور کی ہے۔

مسلم ممالک میں موجود فکری وفقہی مسالک کے اختلاف دو قسم کے ہیں۔

اوّل: اعتقادی اختلاف دوم فقہی اختلاف۔

''پس جہاں تک مسالک میں عقیدے کا اختلاف ہے، تو وہ ایسا اختلاف ہے جو حقیقت میں مسلم ممالک میں ایک بلا اور مصیبت ہے جس نے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور ان کی وحدت کو تفریق سے بدل دیا ہے۔ اور یہ انتہائی افسوسناک حالت ہے جس کو ختم کرنا اور امت

کو اہل سنت والجماعۃ کے اس مسلک پر جمع کرنا لازمی وضروری ہے، جو حضورؐ اور خلافتِ راشدہ کے زمانے سے صحیح فکر اسلامی کا نمائندہ ہے جس کا اعلان حضورؐ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔''

علیکم بسنتی و سنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّشِدِيْنَ الْمَهْدِيْنَ تمسَّكُوا بِهَا وَعَضُّو عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِدَ وَإِيَّاكُمْ وَ مُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ ، فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٌ ضَلَالَةٌ

(ابوداؤد ، احمد ، ترمذی ، ابن ماجه)

''تم پر میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کی اتباع کرنا فرض ہے۔ اس پر قائم رہو اور اسے دانتوں سے مضبوط پکڑ لو۔ دین میں نئی باتوں سے بچو۔ کیوں کہ ہر نیا طریقہ بدعت ہے اور ہر بدعت ضلالت ہے۔''

'' **دوم :** پس جہاں تک بعض فروعی مسائل میں فقہی اختلاف کا تعلق ہے تو اس اختلاف کے کچھ علمی اسباب ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے: اور اسی حکمت بالغہ کے ذریعہ اس نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا ہے اور نصوص سے احکام کے استنباط کے دائرے کو وسعت دی ہے۔ پھر اس رحمت اور وسعت کے ساتھ، وہ فقہی وتشریعی اختلاف نعمت وثروت بھی ہے جس سے امت اسلامیہ کے لئے دین وشریعت پر عمل کا ایک وسیع میدان فراہم ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ کسی ایک شرعی وفقہی رائے پر انحصار کیلئے مجبور نہیں ہوتی ۔ بلکہ اگر امت کے لئے کسی خاص وقت یا کسی خاص مسئلے میں کسی ایک فقیہ ومجتہد کے مسلک پر عمل کرنے میں مشکل اور تنگی پیدا ہو رہی ہے تو عین اسی وقت دوسرے فقیہ کے مسلک میں سہولت ، نرمی اور وسعت کو شرعی دلائل کی روشنی میں ، موجود پائے گی خواہ یہ مسئلہ عبادات سے متعلق ہو یا معاملات سے یا خاندانی ، عدالتی اور تعزیری امور سے۔''

اس لئے اس قسم کے مسلکی وفقہی اختلافات نہ تو ہمارے دین سے متصادم ہیں اور نہ ہی دین میں کسی قسم کا عیب ہیں۔ اور یہ ناممکن ہے کہ دین میں اس طرح کے اجتہادی اور فروعی اختلافات

نہ ہوں ۔ کیوں کہ قرآن وسنت میں بہت سارے نصوص ایسے ہیں جو ایک سے زیادہ معنیٰ پر دلالت کرتے ہیں ۔ اسی طرح کسی ایک نص کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دنیا میں ہر طرح کے حالات وزمانوں میں پیش آنے والے مسائل ومشکلات کا احاطہ کر سکے۔ کیوں کہ نصوص محدود ہیں اور حالات ومسائل لامحدود، جیسا کہ علماء کی ایک جماعت کا قول ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ غور وفکر اور قیاس کے ذریعہ ہم احکام کی علت ، شارع کے مقصد اور مقاصد شریعت کو معلوم کریں اور نئے پیش آمدہ حالات ومسائل کے چیلنج کا شرعی حکم اور حل، ان کی روشنی میں برابر دریافت کرتے رہیں ۔ ایسا کرتے وقت مختلف احتمالات وامکانات کے درمیان علماء کی ترجیحات اور ان کے مفاہیم میں اختلاف کا ہونا لازمی ہے۔ اور حق کی مخلصانہ تلاش وجستجو کے باوجود، ان اختلافات کی وجہ سے ایک ہی مسئلے میں ، شرعی حکم کا مختلف ہونا ، بعید از قیاس اور باعثِ حیرت نہیں ہے۔ پس جس مجتہد کا اجتہادی حکم صحیح ہوگا اس کے لئے دوہرا اجر ہوگا، اور جس کا غلط ہوگا اس کے لئے ایک اجر۔ اور یہ وہ عمل ہے جس کے ذریعہ شریعت سے حرج اور مشکل کا خاتمہ ہوتا ہے اور سہولت ووسعت کی مزید توسیع ہمیشہ کے لئے جاری رہتی ہے ۔ اس لئے اس طرح کے فقہی اختلاف کا وجود، شریعت میں کوئی عیب نہیں ہے۔ عیب تو درکنار، یہ امت مسلمہ کے لئے باعث خیر ورحمت اور ایک قانونی سرمایہ ہے۔

لیکن وہ مسلم نوجوان جو غیر ممالک میں زیر تعلیم ہیں اور جن کی اسلامی تہذیب سے واقفیت بھی کمزور ہے، انہیں ان کے گمراہ اساتذہ، فروعی امور میں فقہی اختلاف کو، عقیدے کے اختلاف کے مثل باور کرا رہے ہیں ۔ جب کہ شریعت میں اگر ایک طرف عقیدہ وعبادات کا اختلاف حرام اور حدود کا اختلاف ممنوع اور ضلالت ہے تو دوسری طرف جزئیات کا اختلاف ، نقص وتناقض پر نہیں بلکہ اللہ کی رحمت اور ازلی وابدی دین ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

''ایک دوسرا گروہ جو تمام فقہی مسالک کو مٹا کر کے امت کو ایک جدید اجتہادی مسلک پر جمع

ہونے اور امت واحدہ بننے کی دعوت لیکر اٹھا ہے، امت میں رائج تمام فقہی مسالک اور ان کے ائمہ پر زبان طعن دراز کرتا ہے، ان سے ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ امت واحدہ کا ایک حصہ اور جزو ہونے کی حیثیت سے ان پر واجب ہے کہ وہ امت کے فقہی مسالک کے تعلق سے اپنے اس سخت اسلوب وانداز سے باز آجائیں جس سے لوگوں میں افتراق پیدا ہوتا ہے اور ان کی وحدت پارہ پارہ ہوتی ہے۔ جب کہ آج وقت کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ دشمنان اسلام کے نہایت خطرناک چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے امت اسلامیہ، وحدت کلمہ کی بنیاد پر، بنیان مرصوص بن جائے۔ امت میں اختلاف وافتراق پیدا کرنے والی اس قسم کی دعوت کی نہ آج کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی مستقبل میں کبھی ہوسکتی ہے۔" (مجلّہ المجمع الفقہی الاسلامی، السنۃ الثانیۃ، العدد الثالث، ص: ۱۷۳)

فروعی امور میں اختلاف، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام ثوری اور امام اوزاعی رحمہم اللہ تعالیٰ کے زمانوں میں موجود تھا۔ لیکن ان جزوی اختلافات میں نہ تو ان کو کسی قسم کا کوئی شر نظر آیا، اور نہ ہی ان میں سے کسی نے یہ کوشش کی کہ دوسرے بھی ان کی اجتہادی رائے کو لازماً قبول کرلیں۔ انہوں نے اپنی اجتہادی رائے سے اختلاف کرنے والوں کے علم اور دین میں کوئی عیب نہیں نکالا، نہ کسی پر کوئی تہمت لگائی۔ بلکہ اس کے برعکس، ان قابل قدر ائمہ نے اجتہادی وفروعی امور ومسائل میں باہم اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے احترام کی اتنی بلند اور اعلیٰ مثال قائم کی جو ساری امت کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ نکسیر پھوٹنے کو ناقص وضو سمجھتے تھے لیکن جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا آپ اس امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے جس نے نکسیر پھوٹنے کے بعد نیا وضو نہ کیا ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ کیا میں امام مالکؒ اور سعید بن مسیّبؒ کے پیچھے نماز نہ پڑھوں گا کیوں کہ ان دونوں کے نزدیک نکسیر پھوٹنے سے وضو نہیں ٹوٹتا!

خلیفہ ہارون رشید نے جب امام مالکؒ کی کتاب موطا کو پوری اسلامی مملکت کا قانون بنانا چاہا اور اس کا ذکر امام مالکؒ سے کیا تو انہوں نے اس سے منع فرمایا اور کہا کہ صحابہ کرامؓ فروعی معاملات میں اختلاف کرتے تھے۔ (مدینہ سے نکل کر) ان کو مختلف شہروں میں آباد ہوئے سالوں گذر چکے ہیں اور وہ لوگ اجتہادی وفروعی امور میں اپنے اپنے علم واجتہاد پر عمل کر رہے ہیں ایسے امور میں سب کو اپنے علم واجتہاد پر عمل کی آزادی کا حاصل رہنا ہی منشائے الٰہی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، حجۃ اللہ البالغۃ میں لکھتے ہیں کہ فقہاء کے درمیان، اختلاف کی اکثر صورتوں میں بالخصوص فروعی مسائل میں ہر فقیہ کے پاس، کسی نہ کسی صحابی کا قول موجود ہوتا ہے۔ جیسے ایام تشریق کی تکبیرات (کی تعداد) عیدین کی تکبیرات (کی تعداد) نکاح محرم، تشہد ابن عباسؓ وابن مسعودؓ، بسم اللہ وآمین میں اخفاء، اقامت میں دو دو بار ہر فقرہ کو دہرانا، وتر کی رکعتوں کی تعداد جیسے مسائل، فقہا اختلافی امور میں ایک صحابی کی رائے کو دوسرے صحابی کی رائے پر ترجیح دیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ سب ہدایت پر قائم تھے۔

صحابہ وتابعین میں اور ان کے بعد بھی، کچھ لوگ نماز میں قرأت شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھتے تھے اور کچھ لوگ نہیں پڑھتے تھے۔ کچھ لوگ بلند آواز سے پڑھتے تھے تو کچھ دھیرے سے۔

ان میں سے کچھ ایسے تھے جو نماز فجر میں دعاءِ قنوت پڑھتے تھے اور کچھ نہیں پڑھتے تھے۔ کچھ لوگ پچھنہ لگوانے، قے کرنے اور نکسیر پھوٹنے کے بعد وضو کرتے تھے اور کچھ نہیں کرتے تھے۔ ان میں کچھ وہ بھی تھے جو عورت اور اعضائے مخصوص کے مس کو، ناقص وضو سمجھتے تھے اور نیا وضو کرتے تھے۔ اور کچھ نہیں بھی کرتے تھے۔ ان میں کچھ لوگ اونٹ کا گوشت کھانے اور آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد وضو کو لازمی سمجھتے تھے اور کچھ لازم نہیں سمجھتے تھے۔

خلیفہ ہارون رشید نے فصد کھلوانے کے بعد، تجدید وضو کے بغیر نماز پڑھائی۔ امام ابو یوسفؒ

نے ان کے پیچھے نماز پڑھی اور بعد میں دہرایا نہیں۔

امام شافعیؒ نے صبح کی نماز، امام ابوحنیفہؒ کے مقبرے کے پاس پڑھی تو امام ابوحنیفہؒ کے ادب کی وجہ سے دعائے قنوت نہیں پڑھی۔

امام ابو یوسفؒ نے جمعہ کے دن ایک ایسے کنوئیں کے پانی سے غسل کیا جس میں چوہا گر گیا تھا۔ غسل کے بعد انہیں اس کا پتہ چلا تو انہوں نے دوبارہ غسل نہیں کیا اور کہا کہ ”میں اس وقت امام مالکؒ کے مسلک پر ہوں۔“ سامری کے بنائے ہوئے بچھڑے کی عبادت کے مسئلے میں حضرت ہارون علیہ السلام و حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان اختلاف ہوا اور دونوں نے ایک ہی واقعہ کو دو الگ الگ رخ سے دیکھا اور دو موقف اختیار کئے۔ ہارون علیہ السلام نے تفرقہ کے خوف سے بنی اسرائیل کو بچھڑے کی عبادت سے منع نہیں کیا۔ جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کی داڑھی اور سر پکڑ کر تنبیہ کی اور ان کو اپنی نافرمانی کرنے کا قصوروار ٹھہرایا۔ (سورہ طٰہٰ: ۹۲۔ ۹۴)

حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے درمیان، بکریوں کے کھیت چرنے کے معاملے کو لے کر، فیصلہ میں اختلاف ہوا۔ قرآن نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی تائید کی۔ لیکن تعریف دونوں بزرگوں کی فرمائی۔ (سورۂ انبیاء: ۷۹)

صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ عذاب اور رحمت کے فرشتوں کے درمیان اس شخص کے بارے میں اختلاف ہوا جس نے سو قتل کئے تھے اور ظالم بستی سے تائب ہو کر صالح بستی کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں اس کو موت آ گئی۔ رحمت اور عذاب کے دونوں فرشتے اس بات پر باہم جھگڑنے لگے کہ اس کا فیصلہ اس کے عمل کے مطابق ہوگا یا اس کی نیت کے اعتبار سے، جو توبہ کے بعد اس نے کی تھی۔ اللہ نے تیسرے فرشتے کو فیصلے کے لئے بھیجا جس نے فیصلہ دیا کہ زمین ناپی جائے۔ اگر یہ میت، صالح بستی سے قریب، اور ظالم بستی سے دور ہو تو اسے رحمت کا فرشتہ لے جائے: اور اگر اس کے برعکس ہو تو عذاب کا فرشتہ اسے لے جائے۔ زمین ناپی گئی تو پتہ چلا کہ صالح بستی سے

قریب ہے اور ظالم بستی سے دور۔ اس لئے میت کو رحمت کے فرشتے کے حوالے کر دیا گیا۔

صحیحین کی حدیث ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے درمیان، ان دو عورتوں کے جھگڑے کے بارے میں اختلاف ہوا جو اپنے چھوٹے بچوں کو لے کر سفر کر رہی تھیں۔ رات کو ایک عورت کے لڑکے کو بھیڑیا اٹھا لے گیا۔ اب ان دونوں عورتوں میں اس بات پر تنازعہ ہوا کہ بھیڑیا کس کا بچہ لے گیا ہے؟ بڑی عورت کہتی تھی کہ زندہ بچہ میرا ہے اور چھوٹی کہتی تھی کہ میرا۔ دونوں عورتیں حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس فیصلے کے لئے گئیں۔ تو فیصلہ بڑی عورت کے حق میں گیا، پھر دونوں حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس فیصلے کے لئے گئیں تو پوری بات سننے کے بعد، حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ چاقو لاؤ، میں اس بچے کے دو ٹکڑے کر کے، دونوں عورتوں میں بانٹ دوں۔ ان کے اس فیصلے پر چھوٹی عورت چلاّئی کہ ”اللہ آپ پر رحم کرے، آپ بچے کے دو ٹکڑے نہ کریں، بچہ بڑی عورت کا ہے: اسے دے دیں“ اس حکمت کے ذریعہ یہ واضح ہو گیا کہ بچہ بڑی عورت کا نہیں بلکہ چھوٹی عورت کا تھا۔ اور حضرت سلیمانؑ نے بچے کو چھوٹی عورت کے حوالے کر دیا۔

درج بالا مثالوں سے یہ واضح ہوا کہ جب انبیاء کرام اور ملائکہ، جو معصوم ہیں، انہوں نے ایک ہی واقعہ کو دو مختلف نقطہ ہائے نظر اور زاویہ نگاہ سے دیکھا اور ان کے درمیان اختلاف واقع ہوا تو جو معصوم نہیں ہیں، ان سے اس بات کی کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ فروعی و جزوی اور اجتہادی مسائل و معاملات میں ان کے درمیان اختلاف نہ ہوگا اور فرائض کے حدود اور دائرے کی طرح فروعی مسائل کے دائرے میں بھی یہ امت، امت واحدہ بن جائے گی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر فروعی، جزوی اور اجتہادی امور و مسائل میں اختلاف، ضرورت، رحمت، وسعت اور ثروت ہے تو قرآن و حدیث کے ان نصوص کا مفہوم و معنی کیا ہے جو اختلاف کی مذمت میں نازل ہوئے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ:

قابل مذمت اختلاف وہ ہے جو اسلام کے عقائد، فرائض، اصول، حدود اور حلال وحرام میں ہو کیوں کہ یہ دین کی بنیاد اور ستون ہیں ان میں کسی بھی قسم کا کوئی اختلاف مذموم ہے، گمراہی ہے۔

قابل مذمت وہ اختلاف بھی ہے خواہ وہ فروعی اور جزوی امور میں ہی کیوں نہ ہو، جس کا سبب، باہمی نفرت وعداوت، خود پسندی، ظلم وزیادتی، دنیا کی محبت اور نفس کی اتباع ہو، اور جو صحیح علم اور واضح ہدایات کے آجانے کے بعد ہو، جس کی نشاندہی اللہ نے سورہ بقرہ آیت: ۲۱۳، سورہ آل عمران آیت: ۱۹ اور سورہ جاثیہ، آیت: ۱۶۔۱۷، میں فرمائی ہے۔

قابل مذمت وہ اختلاف بھی ہے خواہ وہ فروعی امور ہی میں کیوں نہ ہو۔ جس کا حاصل ونتیجہ امت کا باہمی افتراق، انتشار، عداوت ودشمنی ہو، جو امت کو باہم لڑنے والے فرقوں اور گروہوں میں بانٹ دے اور ہر فرقہ اور گروہ باہم لڑائی کا مزہ چکھے۔ جس کی مذمت اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران: آیت ۱۰۵، اور ۱۹، سورہ انفال: آیت ۴۶، سورہ روم، آیت ۳۲، سورہ انعام آیت ۱۵۹، سورہ انبیاء، ۹۲۔ ۹۳، اور سورہ مؤمنون آیت ۵۳۔ ۵۴ میں فرمائی ہے۔

اختلافی امور ومسائل میں اعتدال کی راہ:

ہر وہ شخص جو امت مسلمہ کی صفوں میں اتحاد واتفاق کا حریص ہے یا کم از کم باہم پھٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا چاہتا ہے۔ اور جو تباہی اور نقصان اب تک ہو چکا ہے، اس کا ازالہ چاہتا ہے تو اسے توسط اور اعتدال کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ اور افراط وتفریط اور مبالغہ آرائی سے بچنا پڑے گا۔ جیسا کہ صحابہ کرامؓ اور سلف صالح کے آثار سے واضح ہے اور جس کی نصیحت حضرت علیؓ نے یوں کی ہے:

علیکم بالنمط الأوسط یلحق به التالی و یرجع الیه الغالی:

’’تم پر توسط واعتدال کا راستہ اختیار کرنا فرض ہے، چلنے والوں کو اس پر چلنا چاہئے اور غلو کرنے والوں کو اسی طرف رجوع کرنا چاہئے۔‘‘

توسط واعتدال، عمل کے دائرے کا وہ مرکز ہے جس کی طرف دائیں بائیں اور دور ونزدیک، ہر سمت سے لوگوں کو آنا چاہئے۔ بالفاظ دیگر، وہ صراط مستقیم کے مانند ہے جس کی اتباع کا تاکیدی حکم اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا ہے کہ ہم باہم متفق اور متحد رہیں اور مشرق ومغرب کے جو شیاطین جن وانس ہمیں متفرق راستوں کی طرف بلا رہے ہیں، ان سے خود کو محفوظ رکھ سکیں جس سے اللہ تعالیٰ نے اس طرح خبردار کیا ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْماً فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ● (الانعام۔ ۱۵۳)

’’اور یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو، اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں منتشر کر دیں۔ یہ وہ ہدایت ہے جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے تاکہ تم نافرمانی وکج روی سے بچو۔‘‘

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ (الشوریٰ۔ ۱۳)

’’کہ اس دین کو قائم کرو، اور اس میں تفرقہ میں نہ پڑنا۔‘‘

عن ابن مسعود قال: خط رسول الله خطا بیده ثم قال: هذا سبیل الله مستقیما ثم خط عن یمینه و شماله ثم قال: هذه السبل، لیس منها سبیل إلا علیه الشیطان یدعو إلیه ثم قرأ الآیة الخ۔ (مسند احمد)

’’عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے، انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا کہ یہ اللہ کا سیدھا راستہ ہے۔ پھر اس لکیر کے دائیں بائیں کچھ اور لکیریں بنائیں اور فرمایا کہ یہ مختلف راستے ہیں، ان میں سے ہر راستے پر شیطان بیٹھا ہے جو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ پھر آپ نے سورۂ انعام کی آیت ۱۵۳، تلاوت فرمائی جو اوپر گذر چکی ہے۔

جو لوگ اسلام کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ دین میں شدت

پسندی سے بچیں اور اعتدال کو اپنا شعار بنائیں ۔غلو اور تشدد اختیار کرنے والوں کو رسول اللہ ﷺ نے ہلاکت کی وعید سنائی ہے۔

هلک المتنطعون .و قال ثلاثاً۔(مسلم)

’’ہلاک ہوگئے مبالغہ اور انتہا پسندی کرنے والے۔ یہ بات آپ ﷺ تین بار دہرائی۔‘‘

مختلف صحابہ سے سلف نے مُتَنَطِّعِین کی تعریف یوں کی ہے کہ عبادات میں ایسا غلو جو انہیں شرعی قوانین سے خارج کر دے اور شیطان سے جوڑ دے۔ ایسے مسائل کے بارے میں غور و فکر جن کا واقع ہونا دشوار ہو۔ اور کثرت سے ایسے فروعی مسائل میں الجھنا، جس کی کوئی اصل کتاب و سنت میں نہ ہو۔ ایسے امور سے متعلق سوال کرنا اور ان میں بحث کرنا جن پر بغیر بحث کے ایمان لانا لازمی ہے۔ مثلاً قیامت، روح اور امت مسلمہ کی زندگی وغیرہ۔ حضور ﷺ نے غلو و تشدد سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

ایاکم والغلو فی الدین فانما هلک من کان قبلکم بالغلو فی الدین .(مسند احمد، نسائی ، ابن ماجه)

’’دین میں غلو (انتہا پسندی) سے بچو۔ کیوں کہ تم سے پہلے کی امتیں دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔‘‘

اس میں شک نہیں کہ دین میں غلو، چھوٹے چھوٹے اور معمولی مسائل میں بھی، اپنے مخالفین کے خلاف تعصب اور تفرقہ پر آمادہ کرتا ہے۔ جب کہ عالی ظرفی، کشادہ دلی، فراخی اور فیاضی سے اتحاد اور وفاق وجود میں آتا ہے۔ صحابہ کے درمیان، فروعی مسائل میں فراخی اور فیاضی کی یہی روح تھی جس کی وجہ سے وہ اختلاف کے باوجود باہم تعصب و تفرقہ کا شکار نہ ہوئے۔ وہ غیر ضروری بحثوں وسوالوں سے خود بچتے تھے اور دوسروں کو بھی ان سے منع کرتے تھے کیوں کہ اللہ و رسول نے انہیں اس طرح کی بحثوں اور سوالوں سے منع فرمایا تھا جس سے دین میں سہولت کے بجائے سختی

پیدا ہونے کا امکان ہو۔ چنانچہ درج ذیل آیت، مسائل دریافت کرنے کے سلسلہ میں ایک اصولی رہنمائی فراہم کرتی ہے:

يَـا اَيُّهَـا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡ ا لَا تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡ اَشۡيَآءَ اِنۡ تُبۡدَ لَكُمۡ تَسُؤۡكُمۡ ۚ وَاِنۡ تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡهَا حِيۡنَ يُنَزَّلُ الۡقُرۡاٰنُ تُبۡدَلَكُمۡ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ● (المائده ۔۱۰۱)

’’اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو تم پر اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں لیکن اگر تم انہیں ایسے وقت پوچھو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہو تو وہ تم پر کھول دی جائیں گی۔ اب تک جو کچھ تم نے کیا اسے اللہ نے معاف کر دیا۔ اللہ معاف کرنے والا بردبار ہے۔‘‘

خواہ مخواہ بلا ضرورت سوال کرنے پر آنحضور ﷺ نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے امت مسلمہ کو گذشتہ قوموں کے حالات سے عبرت حاصل کرنے کی تاکید فرمائی:۔

ذَرُوۡنِـیۡ مَـا تَـرَكۡتُـكُـمۡ، فَـاِنَّـمَا هَلَکَ مَنۡ كَانَ قَبۡلَكُمۡ بِكَثۡرَةِسُوَالِهِمۡ وَ اِخۡتِلَا فِهِمۡ عَلٰى اَنۡبِيَاءِ هِمۡ، إِذَانَهَيۡتُكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ فَاجۡتَنِبُوۡهُ ، وَاِذا اُمِرۡتكُمۡ بِشَىۡءٍ فَاتُوۡا مِنۡهُ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ، وَإِذَا نَهَيۡتُكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ فَا دَعُوۡهُ. (رواه احمد و الشيخان و النسائى ، ابن ماجه)

(’’دین کی تمام اہم ضروری باتیں میں نے تم تک پہنچا دی ہیں) جو چیزیں نہیں بتائی ہیں ان کے بارے میں مجھ سے کھوج کرید نہ کرو۔ کیوں کہ تم سے پہلے کی امتوں کی ہلاکت کا سبب، سوال کی کثرت اور اپنے انبیاء سے اختلاف تھا۔ جب میں تمہیں کسی بات سے منع کروں تو اس سے رک جاؤ۔ اور جب میں کسی بات کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اس پر عمل کرو۔‘‘

یہ حدیث بنی اسرائیل کے اس متشددانہ رویے پر روشنی ڈال رہی ہے جو انہوں نے ذبیحہ گائے کے حکم پر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اختیار کیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ تنگی اور سختی میں مبتلا ہوگئے تھے اور اس مخصوص قسم کی گائے کا تلاش کرنا ان کے لئے مشکل ہوگیا تھا۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ صحابہ نے ایک موقع پر حضورؐ سے سوال کیا اور سوال کو کئی بار دہرایا تو حضور ﷺ غضبناک

ہو گئے اور منبر پر چڑھ کر فرمایا:

لا تَسْئَلُوْنِیْ الْیَوْمَ عَنْ شَیْءٍ اِلَّا بَیَّنْتُهٗ لَکُمْ.

''تم آج جن چیزوں کے بارے میں مجھ سے پوچھو گے میں اس کا مفصل جواب تم کو دونگا۔''

حضور ﷺ کا غصہ اور اندازِ بیان دیکھ کر حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے دائیں بائیں دیکھا تو تمام صحابہؓ کپڑے میں منہ چھپا کر رو رہے تھے۔ اسی اثناء میں حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا:

رَضِیْنَا بِاللّٰہِ رَبًّا وَ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ رَسُوْلاً نَبِیًّا ۔

''ہم اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبی اور رسول ہونے پر راضی اور مطمئن ہیں۔''

اس واقعہ نے صحابہ کرامؓ کو بہت بڑا سبق دیا اور اس کے بعد وہ حضورؐ سے غیر ضروری سوال اور کرید سے اجتناب کرنے لگے۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ پورے دورِ نبوت میں انہوں نے کل تیرہ سوالات کے لئے حضور کی طرف رجوع کیا، اور وہ سارے سوالات اہم عملی معاملات سے متعلق تھے۔ ان میں سے ایک سوال بھی نظری یا فرضی نہیں تھا۔ حضورؐ کی اس تعلیم کی وجہ سے، اس کے بعد صحابہ کی تمام توجہ عملی مسائل کے حل میں سہولت و آسانی پر مرکوز ہوگئی اور فرضی اور نظری بحثوں کو انہوں نے بالکل ترک کر دیا۔ انہوں نے اپنے جوابات سے لوگوں کو دین کے معاملے میں تنگی اور مشکل میں نہیں ڈالا، بلکہ لوگوں کی دین سے قربت اور محبت میں اضافہ کیا۔

اجتہادی، فروعی معاملات و مسائل میں صحابہ کا عام طریقہ آسانی و سہولت فراہم کرنے کا تھا۔ اور مسائل میں بال کی کھال نکالنے سے وہ ہمیشہ بچتے تھے۔ ایسی باتوں سے وہ اجتناب کرتے تھے جس کی وجہ سے مسئلہ میں آسانی کی جگہ سختی آجائے اور وسعت کی جگہ دشواری لے لے۔ یہ اللہ کے دین میں ایک منفی عمل ہے اور اللہ کی اس بنیادی و اصولی تعلیم کی عین ضد ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ط

''اللہ نے دین میں تمہارے اوپر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔''

اور یہ کہ:

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ ط

''اللہ تعالیٰ تمہارے لئے نرمی و آسانی چاہتا ہے، تنگی اور مشکل نہیں۔''

یوسف بن ماہکؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس تھا کہ ایک عراقی آیا اور اس نے پوچھا کہ کون سا کفن بہتر ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر تجھے یہ مسئلہ نہ معلوم ہو تو تیرا کیا بگڑ جائے گا اور تیرے دین میں کیا خرابی پیدا ہو جائے گی؟ اس نے پھر کہا: اُمُّ الْمُؤمنینؓ! مجھے اپنا قرآن دکھائیں! حضرت عائشہؓ نے پوچھا: کیا کام ہے؟ اس نے کہا کہ میں اسی کے مطابق قرآن مرتب کروں گا کیوں کہ لوگ غیر مرتب شکل میں قرآن پڑھتے ہیں۔ اُمُّ الْمُؤمنینؓ نے جواب دیا کہ اس سے پہلے جس ترتیب سے تو قرآن پڑھتا تھا، اس سے تیرے دین کا کیا نقصان ہوا؟ (بخاری، فضائل القراءۃ)

علامہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس حدیث کی جو تشریح فرمائی ہے، ملاحظہ ہو: ''شاید ترمذی کی وہ مرفوع حدیث، عراقی سن چکا تھا۔ جس میں مردوں کو کفن دینے کے لے سفید کپڑے کو پاک کہا گیا ہے۔ وہ حضرت عائشہؓ سے اس کی تصدیق چاہتا تھا۔ لیکن اہل عراق دین میں فضول سوال اور لا حاصل بحثوں کیلئے مشہور ہو چکے تھے۔ اس لئے ام المؤمنینؓ نے جواب دیا کہ تیرا کیا بگڑ جائیگا اگر تجھے یہ مسئلہ نہ معلوم ہو۔ یعنی تو جس قسم کا کفن بھی مُردے کو پہنا دے، جائز ہے۔''

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے ایک عراقی نے مچھر کے خون کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے اپنا یہ مشہور قول دہرایا کہ:

''ان عراقیوں کو دیکھو! یہ مچھر کے خون کے بارے میں تو شریعت کا حکم جاننا چاہتے ہیں۔

جب کہ یہ وہ لوگ ہیں جو حضور ﷺ کے نواسے کو قتل کر چکے ہیں اور اس کے لئے انہیں شریعت کا حکم جاننے کی کوئی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔“

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں: ”نبی کریمؐ اور صحابہؓ کے زمانوں میں، دین کے فہم اور اس پر عمل کی غرض سے اجتہادی، فروعی اور جزوی امور میں سہولت وآسانی کو مدنظر رکھا جاتا تھا۔ لیکن بعد کے زمانوں میں اجتہادی، جزوی اور فروعی امور میں سہولت و آسانی کی جگہ شدت پسندی، مبالغہ، سختی اور بال کی کھال نکالنے کو اچھا اور بہتر سمجھا جانے لگا اور دین کی آسانی کو مشکل اور حرج میں بدل دیا گیا۔ مثلاً حضور ﷺ وضو کرتے تو صحابہؓ آپ کے وضو کے عمل کو بغور دیکھتے اور اسی طرح وضو کا طریقہ اختیار کر لیتے، یہ جانے بغیر کہ وضو کے فرائض ومستحبات کتنے ہیں اور کون سے ہیں۔ اسی طرح حضور ﷺ نماز پڑھتے تو صحابہ آپ کی نماز کو دیکھتے اور اسی طرح نماز پڑھنے لگتے جیسا کہ انہوں نے حضور ﷺ کو دیکھا تھا۔ اسی طرح صحابہ نے حضور ﷺ کو حج کرتے دیکھا تو اسی طرح حج کرنے لگے، جیسا کہ آپ کو دیکھا۔ اس زمانے میں دین کی تعلیم کا یہ بہت نمایاں پہلو تھا۔ نہ تو حضور ﷺ نے صحابہ کو یہ بتانے کی ضرورت محسوس کی کہ وضو، نماز، اور حج کے کون سے اعمال رکن یا فرض کا درجہ رکھتے ہیں اور کون سے مستحب ہیں؟ اور نہ ہی صحابہ کرامؓ نے ان کے بارے میں حضور ﷺ سے پوچھا کہ وضو، نماز کے فرائض ومستحبات کون اور کتنے ہیں؟ انہیں کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ان کا وضو، نماز اور حج باطل ہو جائے گا۔ کیوں کہ انہوں نے جزئیات کے بارے میں حضور ﷺ سے بہت کم پوچھا۔“

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے صحابہ کرامؓ سے بہتر کوئی گروہ نہیں دیکھا۔ انہوں نے حضورؐ سے کل تیرہ سوالات کئے اور وہ سب قرآن سے متعلق عملی سوالات تھے اور وہ قرآن میں موجود ہیں۔ انہوں نے کبھی کوئی ایسا سوال حضورؐ سے نہیں کیا جو ان کی عملی زندگی سے متعلق نہ ہو اور جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: عملی زندگی سے غیر متعلق سوالات نہ کرو۔ کیوں کہ حضرت عمرؓ کو میں نے غیر عملی سوالات کرنے والوں پر لعنت بھیجتے ہوئے سنا ہے۔

حضرت قاسمؒ فرماتے ہیں کہ تم ان چیزوں کے بارے میں ہم سے پوچھتے ہو جن کے بارے میں ہم نے کبھی کسی سے کوئی سوال نہ کیا۔ اور تم ان چیزوں کی چھان بین اور تحقیق میں اپنا وقت ضائع کرتے ہو جس میں وقت لگانا ہم لاحاصل سمجھتے تھے۔ تم ان چیزوں کے بارے میں پوچھتے ہو جس کو ہم خود نہیں جانتے اور اگر جان بھی لیں تو اس کا کوئی فائدہ یا نقصان ہماری اپنی عملی زندگی میں نہیں ہے۔

عمر ابن اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کی سیرتوں کو مجھ سے زیادہ جاننے والے بہت کم ہیں لیکن میں نے صحابہ کی سیرتوں میں نمایاں طور پر سہولت وآسانی کا مشاہدہ کیا ہے اور تشدد وسختی سے ان کی سیرتوں کو پاک پایا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ، ج:۱ صفحہ: ۱۴۰-۱۴۱)

محکمات پر توجہ وعمل، اور متشابہات سے اجتناب:

دوسری چیز جو امت کے درمیان اتحاد واتفاق میں معاون ہے اور تفرقہ واختلاف سے امت کو محفوظ رکھنے والی ہے، وہ ہے قرآن کی آیات محکمات میں غور وفکر اور انہیں مرکز توجہ بنانا جو کہ کتاب الٰہی کی جڑ اور اصل ہیں۔ اور متشابہات سے اجتناب کرنا جو اپنے مفہوم ومعنیٰ میں غیر واضح ہے۔ قرآن کی آیات محکمات، دین کے بنیادی عقائد واصول، عبادات، اخلاق، معاملات، معاشرت، معیشت، امر ونہی کے احکام، حدود، فرائض اور حرام وحلال وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ انہیں غور وتدبر، دلیل وحجت اور عمل کیلئے نازل کیا گیا ہے۔ ان میں انسانوں کیلئے صراط مستقیم کی رہنمائی ہے۔ قرآن سے حصول ہدایت کیلئے اہل ایمان پر لازم ہے کہ وہ انہی آیات کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنائیں اور آیات متشابہات کا وہی مفہوم صحیح اور معتبر جانیں جو آیات محکمات کے مطابق ہو کیوں کہ

قرآن کی یہ آیت اوپر گذر چکی ہیں کہ قرآن کے مضامین، تضاد اور اختلاف سے پاک ہیں اور قرآنی آیات باہم ایک دوسرے کی تصدیق کرنے والی ہیں۔ نہ کہ تکذیب!

اس کے بالکل برعکس قرآن کی وہ آیات جن میں ذات باری تعالیٰ، عرش، کرسی، فرشتے، جن، جنت اور دوزخ وغیرہ سے متعلق غیب کی باتوں کو انسانی الفاظ و اصطلاحات میں بیان کیا گیا ہے، ان کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا۔ اس لئے آیات متشابہات کے معنیٰ و مفہوم کو آیات محکمات کے تابع رکھنا چاہئے۔ ان کا جو حصہ سمجھ میں نہ آئے، اسے اللہ کے حوالے کر کے ان پر ایمان رکھنا چاہئے اور ان لوگوں کی روش سے بچنا چاہئے جو اپنے دل کی ٹیڑھ اور فتنہ کی غرض سے ہر وقت آیات متشابہات کے مفہوم و معنیٰ کی تلاش میں لگے رہتے ہیں اور ان کو اپنا خودساختہ معنیٰ بھی پہناتے رہتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

''قرآن میں پانچ قسم کی آیتیں اور مضامین ہیں۔ حلال، حرام، محکم، متشابہ اور امثال۔ پس تم حلال کو حلال سمجھو اور اسے عمل میں لاؤ۔ حرام کو حرام جانو اور اس سے بچو۔ محکم پر اپنے عمل کی بنیاد رکھو۔ متشابہ پر ایمان رکھو اور امثال وقصوں سے عبرت ونصیحت حاصل کرو۔'' (مشکوٰۃ)

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں حضور ﷺ نے سورہ آل عمران کی وہ آیت تلاوت فرمائی جس میں آیات محکمات اور آیات متشابہات کی دین میں حیثیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس معاملہ میں اہل ایمان کا رویہ کیا ہونا چاہئے اور فرمایا کہ ''اے ایمان والو! تم جب یہ دیکھو کہ کچھ لوگ متشابہات کی تاویل کے پیچھے پڑ گئے ہیں تو تم ان سے دور رہو اور بچو، کیوں کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں ٹیڑھ اور فساد ہے۔'' (متفق علیہ)

اسی لئے کہا گیا ہے کہ علم میں پختہ لوگ محکمات پر عمل کرتے ہیں اور اپنے فکر ونظر اور اخلاق و عمل میں اسے اصل الاصول اور قاعدے کا درجہ دیتے ہیں۔

اس کے برعکس جن کے دلوں میں ٹیڑھ اور فساد ہوتا ہے، ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ متشابہات کی تاویل اور اس کے اتباع میں مشغول رہتے ہیں۔

محکمات کو عقیدہ وعمل کی بنیاد اور اصل کی حیثیت سے، جب، جس وقت اور جس زمانے میں بھی ترک کیا جائے گا، باہمی اختلافات اور تنازعہ کا دروازہ کھل جائے گا۔ بالخصوص نازک اور حساس مسائل میں، جن میں قدیم وجدید، دونوں زمانوں کی عقلیں آج تک حیران و پریشان ہیں۔ اور ان میں سب سے زیادہ نازک اور باریک مسئلہ تقدیر جیسے موضوع کا ہے جو صحابہ کے درمیان بھی اختلاف وتنازعہ کا موضوع بن گیا تھا۔ جس پر حضورؐ نے نہایت تند و تلخ لہجے میں نکیر فرمائی تھی۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ:

عن عبدالله ابن عمرؓ قال : إن فقراء كانوا جلوسا بباب النبیؐ ، قال بعضهم : ألم يقل الله كذا ؟ وقال بعضهم : ألم يقل الله كذا ؟ فسمع ذلک رسول الله۔ فخرج كأنما فقئ فی وجهه حَبُّ الرُّمَّان، فقالَ: أبهذا أمرتم أن تضربوا كتاب الله بعضه ببعض؟ إنما ضلت الأمم قبلكم فی مثل هذا ، إنكم لستم مماهنا فی شیءٍ أنظروا الذی أمرتم به فاعلموا به .أنظروا الذی نهيتم عنه فانتهوا عنه .(مسند احمد، ابن حنبل)

''حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ چند فقراء حضورؐ کے دروازے پر بیٹھے تھے ان میں سے ایک نے کہا کہ کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا؟ اس پر دوسرے نے جواباً کہا کہ کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا؟ حضورؐ نے ان کی یہ گفتگو سن لی اور آپ ﷺ اس حالت میں باہر آئے کہ آپ ﷺ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس پر انار کا رس نچوڑ دیا گیا ہو آپ نے فرمایا: کیا تم کو اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ تم کتاب اللہ کے ایک حصے کو، اس کے دوسرے حصے سے ٹکراؤ، تم سے پہلے کی امتیں اسی اختلاف وتنازعہ کی وجہ سے گمراہ ہوئی تھیں، اس لئے تم جو کچھ اس وقت کر رہے ہو، وہ عبث ولاحاصل کام ہے، صحیح کام یہ ہے کہ تم دیکھو کہ تم کو جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس

کوکرو۔اور جن کاموں سے تم کو منع کیا گیا ہے ان سے فوراً رک جاؤ۔''

اجتہادی امور میں باہمی اختلاف کی شدت سے اجتناب:

دین کے اجتہادی وفروعی مسائل میں دو نقطہ نظر یا اس سے زیادہ رایوں کا امکان پایا جاتا ہو تو اس صورت میں اختلافی رائے رکھنے والوں سے ردو قدح اور قطع تعلق سے اجتناب ضروری ہے، کیوں کہ اہل تحقیق علماء وفقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اجتہادی امور ومسائل میں کوئی شخص دوسرے کی نکیر یا مخالفت نہ کرے۔ یا کوئی مجتہد اپنے جیسے دوسرے مجتہد کی نکیر وتردید نہ کرے۔ اسی طرح کسی فقہی مسلک کا پیرو اپنے جیسے دوسرے مسالک کے پیرو کی تضحیک اور مخالفت نہ کرے اور باہم قطع تعلق بھی نہ کرے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سے پوچھا گیا کہ اجتہادی مسائل میں اگر کوئی شخص اپنے مسلک سے ہٹ کر بعض دوسرے علماء کی تقلید کر لے یا دو مختلف فتووں میں سے کسی ایک پر عمل کرے اور دوسرے کو چھوڑ دے تو کیا اس کی مخالفت کی جائے گی؟

انہوں نے جواب دیا کہ'' الحمدللہ، اجتہادی مسائل میں اگر کسی نے بعض علماء کے فتوؤں پر عمل کیا اور بعض کو ترک کر دیا تو اس کی مخالفت یا تردید نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اس سے قطع تعلق کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی مسئلے میں دو قول ہیں اور کوئی شخص ایک کو چھوڑ کر دوسرے پر عمل کرتا ہے تو نہ تو اس کی تردید کی جائے گی اور نہ ہی مخالفت۔ کیونکہ جب دو اقوال میں سے، ایک فتوے کی ترجیح کسی شخص پر واضح ہو جائے گی تو وہ اس پر عمل کرے گا اور راجح قول پر عمل کرنا اولیٰ و بہتر ہوگا: یا دو قول میں سے وہ ان علماء کی تقلید کرے گا۔ جن پر اس کا اعتماد ہے''۔ (واللہ اعلم)

ایک دوسرے موقع پر ابن تیمیہ سے پوچھا گیا کہ اگر ایک شخص مسلمانوں کے معاملات میں کسی خاص کام کا حاکم ووالی ہے، لیکن وہ کام اس کے فقہی مسلک کے خلاف ہے تو کیا اس کے لئے یہ

جائز ہوگا کہ وہ لوگوں کو اس کام سے منع کرے؟

انہوں نے جواب دیا کہ'' نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اجتہادی امور ومسائل میں لوگوں کو اپنے اپنے مسلک پر عمل کرنے کی آزادی شریعت نے دی ہے۔ اس سے منع کرنا اس وقت تک صحیح نہ ہوگا جب تک کہ ممانعت کے لئے کوئی واضح نص کتاب، سنت اور اجماع میں موجود نہ ہو جو اس کی ممانعت پر دلالت کر رہی ہو۔ اکثر علماء اسی بات کے قائل ہیں۔ اور مسلم ممالک میں عوام کا عمل بھی اسی پر ہے''۔

اسی طرح کوئی حاکم اجتہادی مسائل میں دوسرے حاکم کے حکم کو کالعدم اور منسوخ نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی کوئی عالم یا مفتی اجتہادی مسائل میں عوام الناس کو اس بات کا پابند بنا سکتا ہے کہ سارے لوگ صرف اس کے فتوے پر عمل کریں۔

جب خلیفہ ہارون رشید نے اسلامی ممالک کے سارے مسلمانوں کو امام مالکؒ کی کتاب موطا کا پابند بنانا چاہا اور اس کا ذکر اس نے امام مالکؒ سے کیا تو امام نے اسے منع کر دیا اور کہا کہ صحابہ کرامؓ سارے اسلامی ممالک میں پھیل چکے ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے حضورؐ اور قرآن سے علم کو اخذ کیا ہے اور ہر ایک فروعی وجزوی مسائل میں اپنے علم واجتہاد کا پابند ہے تو یہ صحیح نہ ہوگا اور فساد کا موجب بھی ہو سکتا ہے۔

یہ وہ نہایت اہم بات ہے جس کی وجہ سے علماء یہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کا اجماع قطعی حجت ہے اور ان کا اختلاف وسعت اور رحمت ہے۔ اسی بات کو حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ اس طرح کہتے ہیں کہ'' صحابہ کرامؓ اگر اجتہادی وفروعی مسائل میں اختلاف نہ کرتے تو مجھے اس سے کوئی خوشی نہ ہوتی۔ کیوں کہ اگر سارے صحابہؓ کسی ایک اجتہادی رائے اور فرع پر مجتمع ہو جاتے تو ان کی مخالفت کرنے والا گمراہ ہو جاتا۔ اب جب کہ انہوں نے اجتہادی وفروعی امور میں باہم اختلاف کیا تو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک گروہ ایک صحابی کے علم واجتہاد پر عمل کر رہا ہے تو دوسرا، دوسرے

صحابی کے علم واجتہاد پر۔اس طرح سے دین میں آسانی ووسعت کا دروازہ کھل گیا ہے۔'' اوراسی وجہ سے امام مالکؒ کے علاوہ دوسرے ائمہ مجتہدین کا قول بھی یہ ہے کہ کسی فقیہ اور مجتہد کے لئے یہ بات نامناسب ہے کہ وہ لوگوں کو صرف اپنے اجتہادی مسلک پر چلنے کا حکم دے اور دوسرے اجتہادی مسلک کی مخالفت کرے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے موضوع پر لکھنے والے مختلف علماء نے یہ لکھا ہے کہ فروعی و اجتہادی مسائل میں اختلاف کے خلاف، نہی عن المنکر نہیں کیا جائے گا۔اور کسی بھی مرتبہ کے کسی بھی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ لوگوں کو اپنی اجتہادی رائے اور فروعی علم کی اتباع کے لئے مجبور کرے۔ ہاں البتہ علمی دلائل اور مناسب اسلوب میں وہ اپنے مسلک کی صحت اور دوسرے مسلک کی خطا کو واضح کرسکتا ہے۔پھر جب مختلف اقوال میں سے ایک قول کی صحت کسی پر واضح ہوجائے تو اس کی اتباع بھی کرسکتا ہے اور تبلیغ بھی۔لیکن وہ دوسرے قول کی تقلید کرنے والوں پر نکیر کرنے کا مجاز نہیں ہے کیوں کہ فروعی اوراجتہادی مسائل میں ایک سے زیادہ موقف، تفسیر اور طریقہ عمل کی گنجائش ہے۔

فروعی واجتہادی امور میں علماء کے باہمی اختلاف کا علم:

کوئی شخص اختلافی امور میں فیاضی اور وسیع الظرفی کا طریقہ اختیار نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ اجتہادی وفروعی مسائل میں علماء کے اختلاف سے واقف نہ ہو اور اسے یہ نہ معلوم ہو کہ دین کے اندر، جزئیات اور فروعیات میں الگ الگ مسلک کیوں پیدا ہوگئے۔یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ وہ اختلاف کے ماخذ، میلان اور تنوع سے واقف نہ ہو۔اسے ان مسالک کے نقطہ ہائے نظر اور ان کے دلائل سے واقفیت نہ ہو جن سے ان مسالک کے علماء استدلال کرتے ہیں اور جن پر اعتماد و بھروسہ کرتے ہیں اور اسے یہ نہ معلوم ہو کہ یہ سارے علماء شریعت اسلامی کے سمندر سے سیراب ہوتے ہیں اور ان کا یہ اختلاف شریعت کی ابدیت، ہمہ گیری اور وسعت کی

دلیل ہے۔انہی وجوہ سے ہمارے علماء اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ اجتہادی اور فروعی امور میں علماء کے اختلاف کا علم حاصل کرنا اسی طرح واجب ہے جس طرح سے ان کے اتفاق واجماع کا علم حاصل کرنا واجب ہے۔کیونکہ علماء کا قول ہے کہ جو اختلاف کی حقیقت سے واقف نہیں ہے وہ عالم کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔وہ تو ابھی فقہ کی خوشبو سے نابلد ہے۔

آج علماء کی سب سے بڑی مصیبت اور آفت یہ ہے کہ وہ فقہاء کی مختلف آراء میں سے صرف ایک رائے اور ایک نقطہ نظر سے واقف ہیں، جو انہوں نے اپنے (مسلک کے) استاذ سے حاصل کیا ہے اور خود کو اسی دائرے میں محدود کرلیا ہے۔اپنے علاوہ دوسرے فقہا کے مسلکوں کے دلائل سے واقفیت حاصل کرنا، ان کی معقولیت کو جانچنا پرکھنا اور ان کا موازنہ کرنا تو درکنار، مخالف رائے کو سننے کی فرصت نکالنا بھی آج ان حضرات کو گوارا نہیں ہے۔

اگر یہ لوگ اپنے علم کے دائرے کو وسیع کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ ایک مسئلہ یا معاملہ ایک سے زیادہ آراء اور موقف کا متحمل ہوسکتا ہے۔اور باہمی اختلاف وتعارض کے باوجود متعدد راویوں میں توفیق وتطبیق بیک وقت ممکن ہے۔اس طرح کے مسائل میں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ تعصب کو ترک کرکے انصاف وسنجیدگی کے ساتھ دوسروں کے دلائل کو بغور سنا جائے اور ان میں سے سب سے صحیح مسلک کو اختیار کیا جائے۔مثلاً: رمی جمار کے اس مسئلے کو لیجئے کہ جس نے زوال آفتاب سے پہلے کنکری ماری اس کا حج باطل ہوگیا، کیوں کہ یہ سنت کے خلاف ہے۔

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ قربانی کے دن حضور ﷺ نے چاشت کے وقت کنکری ماری اور بعد کے دو دن زوال کے بعد۔(بخاری)

حضرت وبرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمرؓ سے سوال کیا کہ کنکری کب ماری جائے اور کن اوقات میں ماری جائے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ جب تیرا امام کنکری مارے تو تو بھی اس کے ساتھ مار۔

حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں رمی جمار کی سنت قربانی کے دن کے علاوہ، زوال

کے بعد ہے اور یہی جمہور علماء کا قول ہے ۔ حنفیہ نے بھی قربانی کے دن زوال سے پہلے کنکری مارنے کی اجازت دی ہے ۔لیکن عطاؒ وطاؤسؒ نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ان کے خیال میں رمی جمار، زوال سے پہلے مطلقاً جائز ہے۔ جبکہ فقہاء کے نزدیک اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ رمی جمار واجب ہے یا سنت موکدہ۔

کچھ علماء کہتے ہیں کہ ان اختلافی مسائل میں جمہور امت کے مسلک کے خلاف کسی ایک یا دو فقہاء کی بات کا اعتبار نہ ہوگا۔ کچھ دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ وہ چار مسلک جنہیں امت کے سوادِ اعظم نے قبول کرلیا ہے، ان کے خلاف کسی بھی رائے کو رد کردیا جائے گا۔

جب کہ حق یہ ہے کہ اوپر کی یہ دونوں رائیں کتاب وسنت کی کسی دلیل پر مبنی نہیں ہیں ۔ وہ اجماع جو دین میں حجت ہے، وہ کسی شرعی مسئلے میں تمام امت کے مجتہدین کا اجماع ہے اور اگر امت کے ایک مجتہد نے بھی اس سے اختلاف کیا تو وہ جمہور کی اکثریت کا اجماع ہوگا۔ نہ کہ جمہور کا اجماع جو کہ دین میں حجت ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ جمہور امت کی رائے کا اپنا وزن ہے اور اس سے اختلاف کے لئے بہت زیادہ قوی دلائل کی ضرورت ہے لیکن ہر حال میں جمہور کی اکثریت کی رائے ایسی نہیں ہے کہ اس سے اختلاف نہ کیا جا سکے۔

کتنے ہی صحابہ کی مثال موجود ہے کہ جو تمام صحابہ کے مقابلے میں کسی خاص مسئلے میں اپنی انفرادی رائے پر قائم تھے لیکن اس سے ان کے دین میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

بہت سے فقہاء، تابعین تھے جو تمام فقہاء تابعین سے بعض مسائل میں مختلف رائے رکھتے تھے لیکن اس تفرد سے ان کا قول بے اعتبار نہیں ہوا۔ کیوں کہ کسی قول کے اعتبار کا دارومدار حجت اور دلیل شرعی پر ہوتا ہے، نہ کہ کثرت تعداد پر۔

ائمہ اربعہ میں کتنے ہی ایسے ہیں جو کسی خاص مسئلے میں تینوں ائمہ کی رایوں کے مقابلے میں منفرد رائے رکھتے تھے اور اسی پر ان کے مسلک کا عمل جاری ہے اور اس کو ان کے دین کا عیب نہیں

سمجھا گیا۔ جمہور کے نزدیک ان چاروں مسالک کا جو بھی مقام ہو، لیکن جزئیات میں ان کا ہر موقف ومسلک، اللہ کے دین میں حجت نہیں ہے۔ اللہ کے دین میں حجت صرف وہ مسئلہ ہے جو دلیل شرعی سے ماخوذ ومستنبط ہو۔ خواہ وہ منقول ہو یا معقول۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ فقہاء کی یہ رائے شاذ ہے، یہ مہجور ہے اور یہ ضعیف ہے، تو اس رائے کو عمومی اور اطلاقی حیثیت میں لینا درست نہیں ہے کیوں کہ کتنی ہی رائیں پہلے مہجور تھیں بعد میں مشہور ہوگئیں ۔ اور کتنے ہی ایسے اقوال ہیں جو ایک زمانہ میں ضعیف تھے، وہ بعد کے زمانے میں قوی ہو گئے اور کتنے قول تھے جو کسی خاص وقت میں شاذ تھے، لیکن اللہ نے ان کی صحت اور پہچان کے لئے ایسے حالات پیدا کئے جس سے ان کی صحت پر دلیلیں قائم ہوگئیں اور کل کے زمانے میں وہ فتویٰ کی بنیاد بن گئے۔

آج کے زمانے میں ایک نئی آفت جس سے امت دوچار ہے، یہ ہے کہ ایک گروہ جس کا اپنے بارے میں یہ گمان ہے کہ وہ اجتہادی وفروعی مسائل میں اختلاف وتنازعہ کو ختم کرنے کی قدرت و صلاحیت رکھتا ہے خواہ وہ اختلافات اصولی ہوں یا فروعی اور وہ اس طرح کہ جس رائے اور موقف کو وہ حق وصواب کہتے ہیں، اسے پوری امت حق مان لے۔ اور جس کو یہ لوگ رد کردیں اسے پوری امت باطل تسلیم کرلے۔ لیکن یہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ رائے کا عُجب اور خود پسندی ہے اور رائے کے عجب کو حضور ﷺ نے مہلکات میں شمار کیا ہے۔

ان حضرات کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ اختلافی مسئلے میں حدیث کی موجودگی کو نزاع اور اختلاف ختم کرنے کے لئے کافی اور معتبر سمجھتے ہیں اور اپنے اس موقف کو غلط سمجھنے والوں کو حدیث وسنت کا مخالف سمجھتے ہیں حالانکہ ان کی یہ رائے متعدد وجوہ سے نہایت غلط ہے۔

وہ احادیث کو صحیح قرار دینے میں بعض قدیم علماء کی آراء پر اعتماد کرکے، ان کی تقلید کرتے ہیں یا بعض معاصر علماء کی تقلید کرتے ہیں جو حدیث کی تحقیق کے کام میں مشغول ہیں۔ لیکن دوسرے علماء حدیث ان کے اس طریقے اور موقف کو تسلیم نہیں کرتے۔ کیوں کہ فقہاء سلف اور امت کے بڑے

اور قدیم علماء کے درمیان، یہ بات عام اور معروف رہی ہے کہ ایک محدث کے نزدیک اگر ایک حدیث صحیح ہے تو دوسرے کے نزدیک ضعیف۔ کیوں کہ ایک محدث کے نزدیک کسی حدیث کو صحیح قرار دینے کی جو شرائط اور اصول ہیں، وہ اس پر پوری نہیں اترتی ہے۔ اور دوسرے کے نزدیک جو اصول وشرائط ہیں وہ اس پر پوری اترتی ہے۔ حدیث کو جانچنے اور پرکھنے کے اصول وکسوٹی میں بھی محدثین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ جہاں تک راویوں کی جرح اور تعدیل کا تعلق ہے تو اگر ایک محدث کسی روایت کے راویوں کو عادل قرار دیتا ہے تو دوسرا محدث انہی کو مجروح یعنی غیر عادل قرار دیتا ہے۔ ایک محدث ایک حدیث کو جو متعدد ضعیف طریقوں سے مروی ہے، قوی قرار دے کر قبول کر لیتا ہے اور دوسرا اسے قبول نہیں کرتا۔ کیوں کہ اس کے سارے طریقوں میں ضعف ہے۔ ایک محدث حدیث مُرسل کو حجت مانتا ہے اور دوسرا نہیں مانتا۔

مثلاً: وہ احادیث جو عورتوں کے لئے سونے کے زیورات کی حرمت کے بارے میں آئی ہیں۔ بعض محدثین نے ان احادیث کو صحیح قرار دیا ہے تو بعض نے ضعیف۔ اور جنہوں نے صحیح قرار دیا ہے، ان میں بعض کی رائے میں یہ احادیث منسوخ ہیں ان پر عمل نہیں ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی تاویل کی جائے گی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان احادیث کی موجودگی میں امت کے چاروں معروف مسالک کا اس بات پر اجماع ہے کہ سونے کا زیور پہننا عورت کے لئے جائز اور مباح ہے اور پوری امت کا عمل، پورے چودہ سو سالوں سے یہی برقرار ہے۔

بعض محدثین نے اس حدیث کی صحت کو تسلیم کرنے کے باوجود اس حدیث پر عمل کی مخالفت کی ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ یہ حدیث امور تشریعی سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ امور دنیا کے عادی امور سے متعلق ہے جیسے خطبہ جمعہ کے دوران عصا کا ہاتھ میں رکھنا، یا ہاتھ سے کھانا کھانا یا زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانا۔ اور مثلاً حضور کا یہ قول کہ عَلَيْكُمْ بِالْإِثْمِدِ تم پر اثمد (کاجل کی ایک قسم) لگانا لازم ہے۔ کیونکہ یہ آنکھوں کو روشن رکھتا ہے۔ اور بالوں کو بڑھاتا ہے۔ لیکن اگر ایک شخص اس حدیث پر

عمل نہیں کرتا بلکہ آنکھوں کے خصوصی ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کرتا ہے تو وہ نص یا سنت کی مخالفت کرنے والا نہیں ہوگا۔

اور اسی طرح یہ حدیث بھی منجملہ ان احادیث کے ہے جس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ”تم پر گائے کا دودھ لازم ہے کیوں کہ اس کا دودھ دوا، اور اس کا گوشت مرض ہے“ جب کہ طب وصحت اور غذائی تفتیش اور تحقیق کے ذریعہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ گائے کے گوشت میں کوئی مرض نہیں ہے بلکہ وہ اونٹ اور بکری کے گوشت کے مقابلہ میں انسانوں کے لئے زیادہ مفید ہے۔ اس بنا پر اگر کوئی گائے کا گوشت کھائے تو وہ حدیث کا مخالف نہیں مانا جائے گا۔ اور نہ ہی وہ تارک سنت ہوگا۔ کیوں کہ یہ حدیث امور تشریعی سے متعلق نہیں ہے بلکہ دنیا کے عادی امور سے متعلق ہے جس کے بارے میں حضورؐ کا ارشاد یہ ہے کہ:

اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ

”تم اپنی دنیا کے امور ومسائل کے بارے میں زیادہ جانتے ہو۔“

ایک حدیث امور تشریعی سے متعلق بھی ہوتی ہے لیکن فقہاء کے درمیان اس پر بحث وگفتگو یہ ہوتی ہے کہ یہ تشریع جو رسول ﷺ سے ثابت ہے، وہ سربراہ مملکت کی حیثیت سے ہے یا رسول کی حیثیت سے؟ جیسا کہ علامہ ابن قیمؒ نے حدیث (مَنْ قُتِلَ قَتِيلاً فَلَهٗ سُلُبُه) کے بارے میں بحث کی ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک حدیث عمومی اور دائمی تشریعی امور سے متعلق ہوتی ہے لیکن فقہاء کے درمیان، اس کے حکم کی دلالت پر اختلاف واقع ہوتا ہے۔ مثلاً اگر حدیث امر ونہی کے احکام پر مشتمل ہے تو اختلاف یہ ہوتا ہے کہ حکم وجوب کے لئے ہے یا مستحب کے لئے ہے یا صرف تبلیغ کے لئے ہے؟ یہ سارے احتمالات فقہاء کے درمیان قائم رہتے ہیں۔ اور امر ونہی کی دلالت کے بارے میں علمائے اصول کی یہ آراء اور اقوال ہیں اور ہر قول کے لئے ایک دلیل اور نقطہ نظر ہے۔

امر ونہی کے مباحث میں علمائے اصول نے سات اقوال کا ذکر کیا ہے جن میں امر ونہی کے ثبوت اور دلالت پر استدلال کیا جاتا ہے۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ، حضورؐ سے احکام سنتے تھے، اس کے باوجود بھی وہ بعض احکام پر عمل نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ حکم وجوب ولزوم کے لئے نہیں ہے لیکن جب کسی لفظ یا قرینے سے، ان پر حکم کا وجوب ثابت ہو جاتا تھا تو وہ اس پر عمل درآمد میں سب سے زیادہ مستعد اور تیز تھے۔ مثلاً:

رمضان میں غزوہ کے سفر میں صحابہؓ روزے سے تھے، حضورؐ نے انہیں روزہ توڑنے کا حکم دیا تو بعض صحابہؓ نے روزہ توڑ دیا اور بعض نے نہیں توڑا۔ اور حکم کا منشاء یہ سمجھا کہ یہ حکم ان پر نرمی و سہولت کے پیش نظر ہے، وجوب ولزوم کے لئے نہیں ہے۔

پھر جب دشمن کے مقابلے کے لئے قتال کے میدان کے قریب پہنچے تو حضور ﷺ نے کہا کہ کل صبح دشمن کے ساتھ تمہارا مقابلہ ہوگا اور تمہارا روزہ نہ رکھنا تقویت کا سبب ہوگا تو تم کل روزہ نہ رکھو! تو وہ قرینے سے سمجھ گئے کہ یہ حکم وجوب کے لئے ہے۔ چنانچہ سب نے روزہ نہ رکھا۔

صحابہؓ کے سامنے یہ حدیث تھی کہ ”یہود ونصاریٰ بالوں میں رنگ نہیں لگاتے تو تم ان سے ہٹ کر دوسرا طریقہ اختیار کرو۔ اور بالوں میں رنگ لگاؤ“ صحابہ کرام نے اس حکم کو مجرد ارشاد اور استحباب کے معنیٰ میں لیا۔ تو ان میں سے بعض نے اس حکم پر عمل کیا اور اپنے بالوں کو رنگا اور بعض نے نہیں رنگا۔ اور ان میں سے بھی بعض نے مہندی لگائی اور بعض نے کالے رنگ سے بالوں کو رنگا۔

اسی طرح یہ حدیث کہ ”اپنے بیٹوں اور اور بچوں کے نام نافع، یسار اور رباح نہ رکھو“ ہمیں معلوم ہے کہ صحابہ کرامؓ نے اپنے بچوں کے یہ نام رکھے۔ اور اس حدیث کے حکم کو لزوم و وجوب کے معنیٰ میں نہیں لیا جیسا کہ تابعین کے ناموں سے ظاہر ہے۔ مثلاً: نافع بن مولیٰ بن عمر، سلیمان

بن یسارؒ و عطاء بن رباحؒ وغیرہ۔

اسی طرح ہمیں معلوم ہے کہ امام ابن تیمیہؒ نے اس حدیث کے حکم کو وجوب ولزوم کے بجائے استحباب کے معنیٰ میں لیا کہ ”جس نے اپنی شرمگاہ چھوئی اسے چاہئے کہ وہ وضو کرلے۔“

اسی طرح اس حدیث کے حکم کو بھی امام تیمیہؒ نے وجوب کے بجائے استحباب کے معنیٰ میں لیا کہ ”جو اونٹ کا گوشت کھائے اسے چاہئے کہ وہ وضو کرلے۔“ ان دونوں ہی مثالوں میں ابن تیمیہؒ نے اپنے امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک کے خلاف فتویٰ دیا۔

الفاظ واصطلاحات کے مفہوم کی وضاحت اور حد بندی:

اختلاف کی شدت اور اس کے دائرے کو محدود کرنے کے لئے، امت مسلمہ کے درمیان عام طور پر، اور اسلام کی سربلندی کے لئے کام کرنے والوں کے درمیان خاص طور پر، ایک نہایت اہم اور ضروری کام یہ ہے کہ ان الفاظ واصطلاحات کے مفاہیم اور مدلولات کو اچھی طرح واضح کیا جائے جن کی وجہ سے باہم نزاع اور فساد پیدا ہوتا ہے۔ تاکہ ان کے سمجھنے میں جو مغالطہ ہوتا ہے، وہ نہ ہو۔ بہت سارے معاملات میں فریقین کے درمیان نزاع واختلاف نہایت شدید ہو جاتا ہے اور آخر میں پتہ چلتا ہے کہ اختلاف تو صرف لفظی تھا جس کی اصل میں کوئی حقیقت نہ تھی۔

قدیم زمانے کے خوارج نے مسلمانوں کو کافر قرار دے کر ان کی جان ومال کو حلال کرلیا تھا۔ انہی کے نقش قدم پر آج تکفیر کے داعیوں نے بھی وہی کام کیا ہے۔ جدید وقدیم ان دونوں گروہوں کے گمراہی سے دوچار ہونے کے اسباب، اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھے کہ وہ ان بہت سے الفاظ و اصطلاحات کے صحیح مفہوم ومعنیٰ کو سمجھ نہ سکے جو قرآن وسنت میں مختلف موقعہ ومحل کے لحاظ سے آئے ہیں۔ فہم کی اس اپنی کمزوری کی وجہ سے انہوں نے ان الفاظ واصطلاحات کے خود سے وہ مفہوم اور تقاضے متعین کرلئے جو اللہ ورسول کی منشا کے خلاف تھے۔ اس طرح سے خود گمراہ ہو کر انہوں نے

امت کو ایک عظیم فتنے سے دوچار کردیا۔

ان الفاظ و اصطلاحات کے ذیل میں ایمان ، کفر، شرک ، نفاق اور جاہلیت جیسے الفاظ و اصطلاحات ہیں۔ دراصل یہ لوگ ان الفاظ کے مختلف شرعی استعمالات کے درمیان فرق وتمیز نہ کر سکے۔ کیوں کہ قرآن وسنت میں بہت سے مقامات پر یہ الفاظ اپنے حقیقی معنیٰ میں آئے ہیں، تو کہیں کہیں یہی الفاظ مجازی معنیٰ میں بھی آئے ہیں۔ یہ بات قرآن وسنت سے بالکل واضح ہے اور بہت سارے مقامات پر، قرآن وسنت میں ایمان سے مراد، صرف مطلق ایمان کا وجود نہیں بلکہ ایمان کامل ہے جس کا انکار کرنے والا کافر ہوجائے گا۔

مثلاً سورہ انفال آیت نمبر ۲ تا ۴ میں ہے کہ :۔

’’سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں، اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔ اور وہ اپنے رب پر اعتماد کرتے ہیں۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں ایسے ہی لوگ حقیقی مؤمن ہیں۔‘‘ (انفال: ۳۔۴)

اس آیت میں حقیقی مؤمن سے مراد، ایمان کامل کے حامل مؤمنین ہیں۔ ان آیات کا مفہوم یا معنیٰ یہ نہیں ہے کہ جن کے دل اللہ کے ذکر کے وقت نہ کانپیں یا جو اللہ پر توکل نہ کریں وہ کافر ہیں اور ایمان کی اصل سے خارج ہیں۔

یا مثلاً: سورہ مؤمنون کی آیات ۱ تا ۱۰ میں ہے:

’’یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ لغویات سے دور رہتے ہیں۔ زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں۔ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں کے، اور ان عورتوں کے جو ان کی ملکِ یمین میں ہوں۔ کہ ان پر محفوظ نہ رکھنے میں وہ قابل ملامت نہیں ہیں۔ البتہ جو اس کے علاوہ اور کچھ چاہیں تو وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔

جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں اور اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ وہ وارث ہیں جو میراث میں فردوس پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔‘‘

ان آیات میں بھی کامل ایمان والے مؤمنین مراد ہیں۔ ان آیات کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ جسے نماز میں خشوع حاصل نہ ہو یا جو لغویات سے نہ بچے یا زکوٰۃ کے طریقے پر عامل نہ ہو یا شرم گاہوں کی حفاظت میں کوتاہ ہو یا امانت وعہد کو پورا نہ کرتا ہو وہ کافر ہو گیا اور خارج از اسلام ہے۔ نہیں، وہ مؤمن ہے لیکن ناقص الایمان مؤمن!

مثلاً یہ حدیث کہ: ’’زانی زنا کے وقت مؤمن نہیں ہوتا: شرابی، شراب پیتے وقت مؤمن نہیں ہوتا: اور چور، چوری کرتے وقت مؤمن نہیں ہوتا۔‘‘ (متفق علیہ)

اس حدیث میں مطلق ایمان کی نفی نہیں ہے بلکہ کمال ایمان کی نفی ہے: اور اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ جس نے ایک بار گناہ کبیرہ کیا وہ کافر ہوگیا اور ایمان سے خارج ہوگیا۔

اگر اس حدیث میں اصل ایمان کی نفی ہوتی تو زانی، شرابی اور چور کی سزا بھی مرتد کی سزا کی مثل ہوتی۔ اور مرتد کی سزا قتل، زانی کی رجم، شرابی کو کوڑے اور چور کی سزا قطع ید کا یہ فرق نہ ہوتا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جب ایک عادی شرابی پر سزا کے وقت ایک صحابی نے لعنت کی تو حضور ﷺ نے انہیں ٹوکا اور فرمایا: ’’اس پر لعنت نہ کرو۔ خدا کی قسم! یہ اللہ ورسول ﷺ سے محبت کرتا ہے۔‘‘ (بخاری)

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مجرد معصیت، خواہ وہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو، قلب سے ایمان کی اصل کو خارج نہیں کرتی۔

اسی طرح یہ حدیث کہ ’’خدا کی قسم! وہ مؤمن نہیں ہے، خدا کی قسم! وہ مؤمن نہیں ہے، خدا کی قسم! وہ مؤمن نہیں ہے‘‘ صحابہؓ نے پوچھا: کون؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا ’’وہ شخص جس کی تکلیفوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو‘‘ (بخاری)

اس حدیث کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ کافر ہو گیا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اسکے ایمان میں خرابی ہے اور کامل ایمان والا نہیں ہے۔

اسی طرح شرک کا بھی معاملہ ہے۔ ایک شرک اکبر ہے یعنی اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ بنانا۔ ایسے ہی مشرک لوگوں کو اللہ نے المشرکون کہا ہے۔ اور یہی وہ شرک ہے جسے اللہ تعالیٰ کسی بھی حال میں معاف نہیں کرے گا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ ....(النساء :۴۸)

کیونکہ یہی شرک جلی، شرک مطلق اور شرک حقیقی ہے۔

اس کے علاوہ کچھ شرک ایسے ہیں جن کا اطلاق بعض گناہوں پر ہوتا ہے۔ یہ شرک اصغر ہے جو کمال توحید کے منافی ہے۔

مثلاً یہ حدیث کہ: ''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔'' (احمد، ترمذی)

یا یہ حدیث کہ: ''جھاڑ پھونک کرانا، تعویذ لٹکانا اور جادو کرانا شرک ہے۔'' (ابوداؤد، احمد) یا یہ حدیث کہ ''وہ شخص جس نے تعویذ یا گنڈہ لٹکایا اسنے شرک کا ارتکاب کیا۔'' (احمد، حاکم)

اسی طرح لفظ کفر بھی ہے۔ اس میں بھی کفر اصلی اور کفر اکبر، ان ملاحدہ اور دہریوں کے کفر ہیں جو اللہ کے وجود کے منکر ہیں، یا وہ جو نبوت، رسالت، ملائکہ، کتب، یوم آخرت اور تقدیر کے منکر ہیں یا وہ جو بعض رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ یا اللہ کی نازل کردہ بعض چیزوں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض پر نہیں۔ جس کا ذکر سورۂ نساء آیت نمبر ۱۳۶، ۱۵۰، اور ۱۵۱، اور سورۂ مائدہ آیت نمبر ۷۲، ۷۳، میں ہوا ہے۔

دوسرا کفر اصغر ہے۔ یہ اصلی کفر سے علاحدہ ایک کفر ہے جس کا اطلاق بعض گناہوں پر ہوتا ہے۔ قرآن و حدیث میں بار بار لفظ کفر آیا ہے۔ کہیں یہ لفظ اپنے مجازی معنیٰ میں ہے۔ کہیں گناہوں کو کفر کہا گیا ہے اور کہیں کفار کے اعمال کی مشابہت کو کفر قرار دیا گیا ہے اور کہیں ناشکری کو

کفر کہا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ مائدہ آیت نمبر ۴۴ میں ہے کہ:

''اور وہ جو اللہ کی اُتاری ہوئی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی لوگ کافر ہیں۔''

یا مثلاً یہ حدیث کہ:

''مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس کو قتل کرنا کفر ہے۔'' (متفق علیہ)

یا یہ حدیث کہ:

''آدمی کے شرک و کفر کے درمیان فرق کرنے والا عمل نماز ہے۔'' (مسلم)

لفظ شرک اور کفر کے بارے میں جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے، وہی بات نفاق کے بارے میں بھی ہے۔ مثلاً ایک نفاق اکبر ہے جو کہ عقیدے کا نفاق ہے اور بعضے نفاق اصغر ہیں جو عمل کا نفاق ہے۔ عقیدے کے نفاق کا حامل آدمی وہ ہے جو زبان اور اپنے بعض اعمال سے ایمان کا اظہار کرتا ہے لیکن بہ باطن اللہ و رسول کا منکر ہوتا ہے، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورہ البقرہ آیت نمبر ۸۔۹ سورہ المنافقون آیت نمبر ۱۔ ۱۲/ اور سورہ النساء آیت نمبر ۱۴۵/ میں کیا ہے۔

لیکن عمل کے نفاق کا اظہار منافقین کے اخلاق و عادات سے ہوتا ہے۔ ان کے عام برتاؤ اور اعمال سے اس کا پتہ چلتا ہے جب کہ ان کے قلب میں اللہ، رسول اور آخرت کی تصدیق موجود ہوتی ہے۔ یہ وہ منافقین ہیں جن کا ذکر احادیث صحیحہ میں ہوا ہے۔ مثلاً منافق کی علامات تین ہیں: (۱) جب بولے تو جھوٹ بولے (۲) جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔ (۳) جب اس کے سپرد کوئی امانت کی جائے تو اس میں خیانت کرے۔'' (متفق علیہ)

اور یہی حال جاہلیت کے مفہوم کا بھی ہے اس پر کفر اکبر کا اطلاق اس وقت ہوگا جب اس کی وجہ سے عقیدے میں کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اور جاہلیت کو گناہ صغیرہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کی وجہ سے عمل کے وقت مؤمن کے قدم میں لغزش پیدا ہوتی ہے۔ جس مفہوم کا اطلاق، حضور ﷺ کے ان الفاظ میں ملتا ہے کہ: ''تمہارے اندر بھی جاہلیت کے اثرات موجود ہیں۔''

(متفق علیہ) یہ وہ الفاظ ہیں جو حضور ﷺ نے ایک جلیل القدر صحابی کے بارے میں فرمائے تھے۔

بلاشبہ ان قرآنی الفاظ و اصطلاحات کے معنیٰ و مفہوم کی تحدید و توضیح کرنے سے ان کے معنیٰ و مفہوم واضح اور روشن ہو جاتے ہیں اور شبہات دور ہو جاتے ہیں ۔ اختلاف کرنے والوں کی دوری، قربت سے بدل جاتی ہے: اور اگر اختلاف کرنے والوں کی نیتوں میں خلوص ہو تو قربت کے نتیجہ میں اختلاف بھی ختم ہو جاتا ہے۔

مشترک عظیم مقاصد کے حصول کے لئے باہمی جدوجہد:

یہ حقیقت ہے کہ جب قوموں کے دل عظیم مقاصد، بلند عزائم اور اچھی امیدوں سے خالی ہو جاتے ہیں تو وہ باہمی اختلافات میں اُلجھ کر اتحاد و اجتماعیت سے دور ہو جاتی ہیں، اور نہایت حقیر، لاحاصل چھوٹے چھوٹے انتہائی غیر اہم مسائل پر ان کے درمیان جنگ و جدال کا معرکہ برپا رہتا ہے جس کا کوئی فائدہ نہ دنیا میں ہے، نہ ہی آخرت میں۔

اس کے ساتھ ایک دوسری حقیقت یہ بھی ہے کہ مشترک عظیم مقاصد کے حصول کی جدوجہد اور مشترک دشمن سے مقابلے کا فیصلہ، قوموں اور ملتوں کے اندر، اخوت اور اجتماعیت پیدا کرنے کا محرک اور ضامن ہوتا ہے۔ اس لئے آج ملت اسلامیہ کے ساتھ اس سے بڑی کوئی خیانت نہیں ہوسکتی کہ امت کے موجودہ حالات، مشکلات اور مصائب کو نظر انداز کر کے، کوئی شخص امت کو عقیدہ و مسلک کے فقہی و فروعی مسائل میں الجھا دے۔ جن پر ماضی میں امت کے درمیان جنگ و جدال اور معرکہ آرائی ہو چکی ہے جب کہ آج دور دور تک اس بات کی کوئی ادنیٰ امید بھی نہیں پائی جاتی کہ ان جزئی و فروعی مسائل میں پوری امتِ اسلامیہ باہم متفق اور متحد ہوسکتی ہے۔ جو صحابہ کے مقدس گروہ کے درمیان مختلف فیہ تھے۔

اس سے بڑا المیہ اس امت کے لئے اور کیا ہوسکتا ہے کہ انتہائی تند و تلخ اور سخت لہجے میں ایک دوسرے پر تہمت لگائی جائے، الفاظ کے تیروں سے زخمی کیا جائے۔ فتوؤں کی توپیں نصب کر کے میدانِ کارزار گرم کیا جائے۔ ان اجتہادی و فروعی مسائل کی خاطر جن میں ایک سے زیادہ تاویل و تفسیر مقبول ہے ان مسائل میں مخاصمت اور جنگ و جدال کو کس طرح درست قرار دیا جاسکتا ہے۔ جن کی مختلف حالات و زمانے میں مختلف شکلیں ممکن ہی نہیں، ضروری بھی ہوتی ہیں، جو اس دین کی وسعت اور رحمت پر دلالت کرتی ہیں، جن میں حق و صواب کو پالینے والا مجتہد اگر دوہرے اجر کا مستحق ہے تو غلطی کرنے والا مجتہد، صرف معذور و قابل معافی ہی نہیں بلکہ نص حدیث کی رو سے اجر پانے کا مستحق ہے۔

اس لئے آج امت کے تمام مفکرین اور داعیان اسلام پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کو دین کے اصولوں اور بنیادوں پر جمع کر کے انہیں ایک ایسے اتحاد اور اجتماعیت میں باہم جوڑ دیں، جس کو اللہ نے بنیان مرصوص اور امت واحدہ کہا ہے۔ اور یہ امت ایسی جامع اور انقلابی امت وسط بن جائے جو اسلام کے جامع اور مثبت فہم کی حامل ہو۔ سلفیت اور تجدید کی جامع امت۔ ثوابت اور تغیرات کے درمیان، توازن کی حامل امت۔ میراث اسلامی کے تحفظ کے ساتھ، مستقبل اسلام کے لئے منصوبہ ساز امت۔ اور اجتہادی و فروعی مسائل کی معرکہ آرائی سے محفوظ و مامون امت۔ تاکہ ہر شخص فروعی و اجتہادی امور و مسائل میں اپنے علم و اجتہاد کے مطابق، اپنے مسلک پر عامل رہتے ہوئے، امت اسلامیہ کی تعمیر جدید میں اپنا مشترک کردار حصہ ادا کرسکے۔ اور تواصی بالحق و تواصی بالصبر، شہادت علی الناس، امر بالمعروف والنہی عن المنکر اور اقامت دین کا جو عظیم مقصد، ذمہ داری اور بوجھ اللہ تعالیٰ نے پوری امت اسلامیہ پر ڈالا ہے، اس کا اٹھانا اس امت کے لئے آسان و سہل ہو جائے۔

متفق علیہ امور میں باہمی تعاون:

ملت اسلامیہ کے حالات ومسائل پر نظر رکھنے والا ہر شخص یقینی طور پر یہ بات جانتا ہے کہ امت کی آج اصل مشکل اجتہادی وفروعی مسائل میں ایک شخص کا ایک مسلک کو ترک کر کے دوسرا مسلک یا دوسرے مسلک کو چھوڑ کر تیسرا مسلک اختیار کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی مشکل امت کی یہ ہے کہ مختلف فیہ جزئی اور فروعی امور میں انہماک کی وجہ سے، امت ان متفق علیہ امور کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے جن پر پوری امت اور تمام مسالک کے حاملین کا اتفاق ہے، جو دین کی اصل اور بنیاد ہیں۔

آج ملت اسلامیہ کی اصل مشکل یہ نہیں ہے کہ ایک شخص، سلف کے صحیح اور راجح مسلک کو چھوڑ کر، صفات الٰہی پر مبنی آیات واحادیث کی تاویل کرتا ہے بلکہ وہ شخص ہے جو مشرقی ومغربی افکار کا بندہ بن کر، صفات الٰہی اور ذات الٰہی دونوں کا منکر ہے۔

اصل مسئلہ اس شخص کا نہیں ہے جو اللہ کو عرش پر متمکن مانتا ہے یا اللہ کی عظمت کے پیش نظر کنایۃً ایسا کہتا ہے بلکہ وہ شخص ہے جو عرش اور رب العرش، دونوں کا ایک ساتھ منکر ہے۔

اصل مشکل وہ لوگ نہیں ہیں جو نماز میں بسم اللہ زور سے یا آہستہ سے پڑھتے ہیں یا بالکل پڑھتے ہی نہیں، یا جو نماز میں دونوں ہاتھ باندھتے ہیں یا لٹکائے رکھتے ہیں یا جو رفع یدین کرتے ہیں یا نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ ہیں جو نہ اللہ کو پہچانتے ہیں، نہ مسجد کو، نہ نماز کو اور نہ رکوع وسجود کو۔

اصل مسئلہ وہ لوگ نہیں ہیں جو شوال یا رمضان کے چاند کے ثبوت کے لئے کسی معتبر مسلک کی پیروی نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ ہیں جو رمضان میں بھی اسی طرح رہتے ہیں جیسے شعبان میں تھے اور شوال میں بھی ویسے ہی رہیں گے۔ جو نہ روزہ جانتے ہیں، نہ تراویح بلکہ جان بوجھ کر نہایت ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ دن کو علی الاعلان کھاتے پیتے ہیں۔

اصل مشکل وہ عورت نہیں ہے جو گھر سے باہر نکلتے وقت چہرے پر نقاب نہیں ڈالتی اور ہاتھوں میں دستانے نہیں پہنتی بلکہ وہ عورت ہے جو سر بازار اپنا سر، گردن، سینہ اور پیٹھ کا کچھ حصہ کھلا رکھتی ہے، جو چھوٹے، عریاں اور ایسے باریک لباس پہنتی ہے کہ اسے زیب تن کرنے کے بعد بھی ننگی ہی رہتی ہے جسے دیکھ کر شرافت وانسانیت شرم سے سر جھکا لیتی ہے۔

امت کا حقیقی مسئلہ اور مشکل، ملت کا وہ سواد اعظم ہے جو عقیدے کی کمزوری، شریعت سے انحراف، اخلاقی بے راہ روی میں مبتلا ہے۔ ترک صلوٰۃ، انکار زکوٰۃ، اتباع شہوات اور فحش کی اشاعت جس کی پہچان بن چکی ہے، جو رشوت ستانی اور صریحاً محرمات کے ارتکاب کا خوگر بن چکا ہے اور اللہ ورسول ﷺ کے دشمنوں سے دوستی ومحبت کی پینگیں بڑھانے والا ہے۔

امت کے لئے مسئلہ تو وہ لوگ ہیں جو عقل کو بالائے طاق رکھ کر عقل کا بطلان کرتے ہیں، فکری جمود اور عزم وارادے کی کمزوری کے شکار ہیں۔ جو آزادی فکر ورائے کے مخالف، فرائض وواجبات سے غافل، خود پسندی کے جنون میں مبتلا اور قوم پر حکام کے جبری غلبہ کی نمائندگی کرنے والے ہیں۔

آج اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے کام کرنے والوں پر، سب سے پہلا یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی جدوجہد اور کوشش کو، امت کے درمیان متفق علیہ امور پر مرکوز کر دیں اور امت جن امور ومسائل میں متفق اور متحد ہے، اس میں باہمی تعاون کا آغاز کریں۔ کیوں کہ متفق علیہ امور میں یہ باہمی تعاون، فریضہ بھی ہے اور ضرورت بھی۔ یہ وہ فریضہ ہے جسے اسلام نے عائد کیا ہے۔ اور یہ وہ ضرورت ہے جو حالات کا تقاضا ہے۔

جو چیزیں امت کے درمیان متفق علیہ ہیں، وہ کچھ حقیر، جزوی اور کمتر نہیں ہیں، بلکہ وہ دین کے بنیادی عقائد، فرائض اور واجبات وغیرہ ہیں۔ ضرورت صرف ایسی کوشش کی ہے جس میں کوئی توقف اور خلل نہ ہو۔ ایسے عمل کی ہے جو کسی سہارے کا محتاج نہ ہو۔ ایسے مضبوط عزم وارادہ کی

ہے جس میں کوئی کمزوری نہ ہو۔ ایسی بیدار اور آگاہ عقل کی ہے جو صحیح رہنمائی پر قادر ہو۔ ایسے پاک نفوس جوانوں کی ہے جو اخلاص کا پیکر اور جذبہ عمل سے سرشار ہوں اور ایسی اجتماعی قوت و طاقت کی ہے جو تعمیر جدید پر قادر ہو۔

کیا امت، اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانے میں متفق نہیں ہے؟ کیا ہم اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ پر متفق نہیں ہیں جو قرآن وحدیث میں بیان ہوئے ہیں؟ کیا ہم پر اپنے بچوں اور نوجوانوں کے دلوں میں خدائے واحد پر، قرآن وسنت سے ماخوذ، ایمان پیدا کرنے کے لئے باہمی تعاون فرض نہیں ہے؟

کیا ہم اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ آج انسانیت اور اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ، الحاد اور دہریت ہے؟ الحاد و دہریت کی اس وبا کے نتیجے میں، امت کے نوجوانوں کے افکار وعقائد میں جو شکوک پیدا ہو رہے ہیں، ان سے نوجوانوں کو محفوظ و مامون رکھنے کے لئے، اور ان کے دلوں میں ایمان باللہ کی شمع روشن رکھنے کے لئے کیا ہم پر باہمی تعاون فرض نہیں ہے؟

کیا امت، آخرت کے گھر پر ایمان، جنت، دوزخ پر ایمان اور عمل کی جزا وسزا پر ایمان لانے میں باہم متفق نہیں ہے جو کہ ایمان باللہ کے ساتھ مل کر، انسان کے نفس میں ایک پہرے دار بٹھا دیتا ہے، جو اس کو ہر خیر پر آمادہ کرتا ہے اور ہر شر سے بچاتا ہے۔ کمزوری اور بزدلی کے موقعہ پر اس کے عزم وارادہ کو مضبوط کرتا ہے اور مایوسی کے موقعہ پر امید کی کرن دکھاتا ہے۔ تو کیا جزا اور سزا اور ایمان بالآخرۃ کے عقیدے کو پختہ کرنے کے لئے ہم پر باہمی تعاون فرض نہیں ہے کہ اس عظیم عقیدے کے گرد شک کی جو فضا ہے، وہ دور ہو؟

کیا ہم اسلام کے بنیادی ارکان پر ایمان میں باہم متفق نہیں ہیں؟ کیا بہترین اسلوب وانداز میں سمع وبصر کے تمام وسائل کو استعمال میں لا کر، ان ارکان اسلام کی تعلیم، ترغیب اور تذکیر میں باہمی تعاون ہم پر فرض نہیں ہے؟

کیا ہم اللہ تعالیٰ، ملائکہ، کتابوں، انبیاء ورسل، یوم آخرت اور تقدیر کے خیر وشر پر ایمان میں باہم متفق نہیں ہیں؟ کیا قرآن وسنت کی روشنی میں آسان طریقے سے قدیم وجدید کی فضول بحثوں سے بچ کر، قرآن وسنت کی روشنی میں ان عقائد کو ایمان والوں کے دل ودماغ میں جمانے اور راسخ کرنے میں باہمی تعاون ہم پر فرض نہیں ہے؟

کیا ہم ان مکارم اخلاق پر، جس کی تکمیل کیلئے حضور ﷺ مبعوث ہوئے، جو آپ کی سیرت کا نہایت اہم حصہ ہیں، جیسے اللہ پر توکل، اس کی نعمتوں پر شکر، اس کی آزمائش پر صبر، اس کے فیصلے پر راضی بہ رضا اور اس کی رحمت سے امید، اس کے عذاب کا خوف، اس کیلئے اخلاص و محبت، اس سے ملاقات کا شوق اور اس کی یاد سے سکون قلب اور تسکین وغیرہ امور میں کیا ہم باہم متفق نہیں ہیں؟ یا صدق امانت، ایفائے عہد، شجاعت، سخاوت، حیا، تواضع وانکساری، نظم وضبط اور تعاون باہمی جیسے انسانی، اسلامی اور اخلاقی قدروں کے فروغ پر ہم باہم متفق نہیں ہیں؟ تو کیا ان فضائل کی اشاعت اور معاشرے میں ان کے رسوخ وثبات کی جدوجہد اور کوشش میں باہمی تعاون ہم پر فرض نہیں ہے کہ پاکیزہ ماحول میں بچے جوان اور جوان بوڑھے ہوں۔

کیا ہم قرآن وسنت کے محکم وثابت، قطعی اور پاکیزہ شرعی احکام کے مجموعے پر باہم متفق نہیں ہیں جن پر پوری امت جمع ہے اور جن سے امت کی اخلاقی، شعوری اور فکری وحدت کی تشکیل ہوئی ہے؟ تو کیا اپنے ملک کی سماجی اور اجتماعی زندگی میں ان احکام پر عمل، اور احسن طریقے سے اس کی طرف دعوت اور اس کے نفاذ میں باہمی تعاون ہم پر فرض نہیں ہے؟

کیا ہم اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ آج صہیونیت، اسلام اور مسلمانوں کے لئے خطرہ ہے اور مسلمانوں کی دینی، فوجی، سیاسی، معاشی، اخلاقی، اجتماعی اور تہذیبی شناخت کو صہیونیت کے علمبردار ملیامیٹ کرنے کے درپے ہیں؟ تو کیا اس صہیونیت کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے باہمی تعاون ہم پر فرض نہیں ہے کہ ہم منسوخ یہودیت کا مقابلہ، مروّج اسلام سے، محرّف توراۃ کا

مقابلہ محفوظ قرآن سے اور اباطیل تلمود کا مقابلہ، حقائق قرآن وسنت سے کر سکیں؟

کیا ہم اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ نصرانیت کی نمائندہ مغربی طاقتیں، اسلامی دنیا کے حالات سے فائدہ اٹھا کر، اپنے جدید ترین اور بے پناہ وسائل کی طاقت اور مدد سے، خاموشی کے ساتھ مسلمانوں کو نصرانی بنا رہے ہیں؟ اور مسلم دنیا میں طرح طرح کے فتنوں کی آگ بھڑکا کر ہمیں دن بدن کمزور کرتی جا رہی ہیں؟ کیا مغربی دنیا کی اس یلغار کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم سب پر باہمی تعاون اور نصرت فرض نہیں ہے؟ اور کیا ملت اسلامیہ کی بقا اور دین وعقیدے کے تحفظ کے لئے مل جل کر جدوجہد کرنا ہم پر فرض نہیں ہے؟

کیا ہم اس بات پر متفق نہیں کہ کمیونسٹ، ہمارے عقیدے، فکر اور تہذیب کے خلاف ہماری اپنی سرزمین پر جنگ لڑ رہے ہیں؟ تو کیا کمیونسٹوں کے اس فکری، تہذیبی، سیاسی اور فوجی حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے باہمی تعاون ونصرت ہم پر فرض نہیں ہے کہ ہم سرخ سامراج کے حملے سے اپنے عقائد، اخلاق، شریعت اور اپنے روحانی ومادی وجود کو بچا سکیں؟

کیا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف آر، ایس، ایس اور اس کے پریوار کی فرقہ وارانہ اور جارحانہ دشمنی اور خطرناک خفیہ منصوبوں سے ہم واقف نہیں ہیں؟ کیا ان کی جارحانہ دشمنی کے خاتمے کی خاطر، ملت اسلامیہ کے لئے باہمی اخوت، تعاون اور نصرت کی بنیاد پر، بنیان مرصوص بن جانا فرض نہیں ہے۔ تاکہ اس زرد سامراج کے حملے سے ہم اپنے مادی وروحانی وجود اور دین و شریعت کا تحفظ کر سکیں؟

کیا ہم اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ پوری دنیا میں، مسلمانوں کی اکثریت، ایمان، اسلام اور اس کے تقاضوں سے ناواقف ہے اور اپنی اس جہالت کی وجہ سے، آج مسلمان ہر قوم کے لئے نرم چارہ بن گئے ہیں؟ تو کیا مسلمانوں کے درمیان، اسلام کی تعلیم کو عام کرنے کے لئے ہم باہم تعاون نہیں کریں گے؟ کہ مسلمانوں کو عقائد، ارکان دین، عبادات، اخلاق اور آداب کی تعلیم سے

کما حقہ واقف کرا سکیں؟

کیا ہم اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ اس دنیا کی بڑی اکثریت اسلام سے ناواقف ہے؟ اور اگر کچھ واقف بھی ہیں تو ان کی واقفیت ناقص اور ادھوری ہے؟ تو کیا آج امت مسلمہ اسلام کے پیغام کو دنیا کی تمام قوموں کے سامنے، ان کی اپنی زبانوں میں پہچانے کی ذمہ دار نہیں ہے؟ کہ اسلام کے تعلق سے ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے اور ان پر حجت قائم ہو جائے؟ شہادت علی الناس کے اس عظیم اسلامی فریضے کی ادائیگی کے لئے، کیا باہمی تعاون ہم پر فرض نہیں ہے؟

کیا اس تلخ حقیقت پر ہم سب کا اتفاق نہیں ہے کہ پوری اسلامی دنیا میں، شریعت اسلامی کے نفاذ کو روکنے کے لئے تمام سیکولر طاقتیں آگے آگے ہیں خواہ وہ دائیں بازو والے ہوں یا بائیں بازو والے؟ تو کیا اسلام کے خلاف سیکولر طاقتوں کی اس یلغار اور مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لئے دنیا کے تمام مسلمانوں کو بالعموم اور تمام اسلام پسندوں پر بالخصوص باہمی تعاون فرض نہیں ہے؟

ان سنگین حالات میں اجتہادی وفروعی امور میں اختلاف کے باوجود تمام اسلامی طاقتوں کو اپنی صفوں میں اتحاد واتفاق پیدا کرنے کے لئے کیا باہمی تعاون فرض نہیں ہے؟

جہاں آج کے حالات میں مذکورہ بالا تمام معاملات ومسائل میں ملت اسلامیہ کے تمام افراد کے درمیان باہمی تعاون ونصرت فرض ہے، وہیں موجودہ حالات میں اسلامی طاقتوں، جماعتوں، اداروں اور افراد کے لئے یہ بات انتہائی نامناسب اور غلط ہوگی کہ ہم جزوی اور فروعی مسائل میں معرکہ برپا کر کے، امت کو مختلف گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دیں۔

اختلافی مسائل میں باہمی نرمی وفیاضی:

جہاں متفق علیہ امور میں باہمی تعاون واجب ہے وہیں مختلف فیہ امور میں باہمی نرمی اور درگذر بھی واجب ہے۔ اس سنہرے اصول کو علامہ سید محمد رشید رضاؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

نتعاون فیما اتفقنا علیه ، ویعذر بعضنا بعضا فیما اختلفنا فیه. (تفسیر المنار)

''یعنی متفق علیہ امور میں ہم باہم تعاون کریں گے اور اختلافی امور میں ہم میں سے ہر ایک دوسرے کو معذور سمجھے گا۔''

اختلافی مسائل میں معذور سمجھنے کا معنیٰ یہ ہے کہ اپنی یا اپنے امام کی اجتہادی رائے اور مسلک کے معاملے میں دوسرے امام کی اجتہادی رائے و مسلک کے خلاف کسی کے دل میں کوئی تعصب اور ضد نہ ہو۔ کیوں کہ بڑے سے بڑے مجتہد کے اجتہاد میں صواب وخطا، دونوں کا امکان ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ اور مجتہد کے اجتہاد کے صحیح ہونے کی صورت میں دو اجر ملتا ہے اور اجتہاد میں خطا کی صورت میں بھی وہ ایک اجر پاتا ہے۔

امام شافعیؒ جیسے عالی مرتبہ مجتہد، اجتہادی آراء کو صحیح اور غلط سمجھنے کیلئے یہ اصول بیان کرتے ہیں:

رأئی صواب یحتمل الخطأ و رائ غیری خطأ یحتمل الصواب .

''میری رائے و اجتہاد صحیح ہے غلطی کے امکان کے ساتھ، اور دوسروں کی رائے غلط ہے صحت کے امکان کے ساتھ۔''

اجتہادی رائے میں، صواب وخطا کے امکان واحتمال کا تقاضا ہے کہ، اختلافی امور میں کسی بھی اجتہادی رائے کو حتمی اور یقینی طور پر صحیح نہ مانا جائے اور یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ فروعی و اجتہادی امور میں اختلاف کرنے والوں کے ساتھ باہم نرمی وفیاضی کا معاملہ کیا جائے۔

اختلافی امور میں نرمی ودرگزر کرنے میں دوسری چیز جو بہت زیادہ معاون ہوتی ہے کہ ایک ہی معاملے میں ایک سے زیادہ نقطۂ نظر بھی حق ہو سکتے ہیں۔

ایک شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ ایک معاملہ میں حق وصواب ہمیشہ صرف ایک ہی ہوگا۔ دو یا دو سے زائد نقطہائے نظر بیک وقت حق نہیں ہو سکتے؟

اصول فقہ کے ماہرین اس اعتراض کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اجتہادی مسئلے میں مجتہد کا اجتہاد

حق وصواب ہوتا ہے اگر چہ اجتہاد اور اس کے نتائج میں باہم تنوع کے بجائے، تضاد کا اختلاف ہی کیوں نہ پایا جائے۔ اس لئے کہ ایک مجتہد کے نزدیک ایک چیز حلال ہوتی ہے تو وہی چیز دوسرے مجتہد کے نزدیک حرام ہوتی ہے۔ اس لئے اجتہادی امور میں حق وصواب مختلف اور متعدد ہو سکتے ہیں۔ بعض اعمال کو حضور نے خود مختلف اور الگ الگ طریقوں پر ادا کرنے کی اجازت دے رکھی تھی اور حق وصواب کو کسی ایک طریقے میں محصور نہیں کیا تھا۔

اس کی سب سے واضح مثال قرآن کریم کی مختلف لہجوں میں تلاوت کا جواز ہے۔ آنحضور ﷺ نے مختلف قبائل کے الگ الگ لہجوں کی رعایت کرتے ہوئے سات یا دس لہجوں میں تلاوت قرآن کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔

چنانچہ جب عبداللہ ابن مسعودؓ نے اپنی قرأت سے الگ قرأت پر قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو پڑھنے والے پر اعتراض کیا۔ اور اس کو لے کر حضور ﷺ کے پاس آئے۔ تو حضور ﷺ نے دونوں کی باتیں سن کر فرمایا کہ تم دونوں حق پر ہو۔ (کِلَا کُمَا مُحسِنٌ)

کچھ امور و معاملات ایسے ممکن ہیں جن میں حالات و زمانے کے بدل جانے کی وجہ سے یا مخصوص حدود و قیود کی وجہ سے حق وصواب ایک سے زائد ہو جائیں۔ جیسے ایک ہی مسئلے میں دارالاسلام کے احکام، دارالکفر سے مختلف ہوں گے۔ دارالسنۃ اپنے احکام میں دارالبدعۃ سے جدا ہوگا۔ مقیم اور مسافر کے احکام میں فرق ہوتا ہے۔ غلام وآزاد کے احکام الگ ہوتے ہیں۔ قوت وطاقت کے زمانے کے احکام، ضعف وکمزوری کے زمانے میں بدل جاتے ہیں۔

فقہی مسائل کے تعلق سے اب تک جو گفتگو کی گئی ہے، اس کا اطلاق، سیاسی اور اجتماعی امور و مسائل پر بھی ہوگا۔ حالات و زمانے کے تغیر سے، سیاسی و اجتماعی اصلاح کے طریقے میں تبدیلی ناگزیر ہوگی۔

فقہ اسلامی کا یہ مشہور قاعدہ ہے کہ زمانہ، جگہ، حال، اور ظرف کے بدل جانے سے ایک ہی

مسئلے میں فتویٰ اور حکم بدل جاتا ہے۔

مثلاً: صحابہ کرامؓ نے زمانہ وحالات کے بدل جانے کی وجہ سے، حضور ﷺ کے عمل سے مختلف اور الگ عمل کیا۔ اور عراق، شام اور مصر کی زمینوں کو فاتحین (مجاہدین) کے درمیان اس طرح تقسیم نہیں کیا، جس طرح حضور ﷺ نے خیبر کی زمین کو فاتحین کے درمیان تقسیم کیا تھا۔

اختلاف امت کے خوف سے، حضرت عثمانؓ نے صحابہ کے مشورے سے قرأت قریش کے علاوہ ان تمام قرأتوں کو منسوخ کر دیا جس کی اجازت حضور ﷺ نے دی تھی۔

اسی طرح ائمہ اربعہ کے جلیل القدر شاگردوں نے زمانے وحالات کے بدل جانے کی وجہ سے اپنے اپنے شیوخ سے اختلاف کیا۔ یہ بات پوری تفصیل کے ساتھ، فقہ کی تاریخ میں ریکارڈ پر موجود ہے۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے اپنے استاذ محترم امام ابوحنیفہؒ سے جو اختلاف کیا، وہ دلیل و برہان کا اختلاف نہیں تھا بلکہ حالات اور زمانے کے تغیر و تبدیلی کا اختلاف تھا۔

نبی کریم ﷺ نے لوگوں کے مخصوص حالات کی رعایت کر کے، بعض ایسے فتوے دئے جس کے بارے میں اصول فقہ کے ماہرین کی رائے یہ ہے کہ اس شخص کے لئے وہ حکم خاص تھا۔ اور یہ حکم، عام لوگوں کے لئے نظیر نہیں بنایا جاسکتا۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے اپنے زمانے میں اپنے عمال (گورنروں) کو ہدیہ قبول کرنے سے منع فرمادیا۔ جب ان سے کہا گیا کہ حضور ﷺ تو ہدیہ قبول کرتے تھے تو انہوں نے فرمایا کہ وہ حضور ﷺ کے لئے ہدیہ تھا اور یہ ہمارے لئے رشوت ہے۔

غزوہ بنو قریظہ کے وقت عصر کی نماز میں صحابہ کا بیک وقت دو مختلف عمل بہت مشہور ہے لیکن حضور ﷺ نے کسی کو خطا کار نہیں کہا اور دونوں کی تائید فرمادی۔

جو شخص دین کے محرمات اور فرائض کا انکار کرے وہ باتفاق فقہاء کافر و مرتد ہے۔ لیکن جاہل و گنوار دیہاتی جسے تعلیم کا موقع نہ رہا ہو، وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ اسے جاننے اور علم حاصل

کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

شرابی کے لئے حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں چالیس کوڑوں کی سزا تھی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے بڑھا کر اسّی (۸۰) کوڑے کر دئے۔ کیوں کہ لوگ پینے سے باز نہیں آرہے تھے۔

امام ابن قیمؒ نے اپنے شیوخ ابن تیمیہؒ کا قصہ بیان کیا کہ وہ اور ان کے ساتھی دمشق میں کہیں جا رہے تھے۔ راستہ میں تاتاریوں کے ایک گروہ کو شراب میں مدہوش دیکھا تو ابن تیمیہؒ کے ساتھیوں نے اس منکر پر ان کو منع کرنا چاہا۔ لیکن ابن تیمیہؒ نے اپنے ساتھیوں کو روک دیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو اس لئے حرام فرمایا ہے کہ شراب کی مدہوشی انسان کو نماز اور اللہ کے ذکر سے روکتی ہے: اور انہیں شراب کی مدہوشی نے قتل و غارت گری سے روک رکھا ہے۔ (لہٰذا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔) یہ ہے حقیقی فقہ جو فتوے اور حکم کو کسی ایک حالت پر منجمد نہیں کرتی بلکہ علل و مقاصد پر نظر رکھتی ہے۔ اور فتویٰ و حکم، علل و مقاصد کی رعایت کے گرد گھومتا اور بدلتا رہتا ہے۔

آج اسلام کے علمبرداروں کو اختلافی امور میں نرمی، وسیع الظرفی اور درگذر سے کام لینا چاہئے۔ کیوں کہ اختلاف کی بہت ساری قسمیں، جن کا مشاہدہ، آج ہم اسلامی ممالک میں کر رہے ہیں، وہ حکم شرعی کے اختلافات نہیں ہیں بلکہ وہ زمینی حقائق اور حالات واقعی سے متعلق، تجزیہ، تجربہ، علم اور فکر ونظر کے اختلاف ہیں جسے فقہاء اپنی اصطلاح میں تحقیق المناط کہتے ہیں۔ مثلاً:

ایسا شخص جو منکر کو طاقت کے زور سے روکنے اور مٹانے کی قدرت رکھتا ہو اور اس کے نتیجے میں اسے اپنی جان کی ہلاکت یا ناقابل تلافی نقصان یا متوقع فائدہ سے زیادہ دینی نقصان کا خطرہ نہ ہو یا اس سے بڑے منکر کے وجود میں آنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو اس پر فرض ہے کہ وہ بلا تامل منکر کو طاقت کے زور سے مٹا دے۔ اور اگر اس کی طاقت نہیں ہے تو زبان و قلم سے اس کے خلاف آواز اٹھائے اور اگر اس کی بھی طاقت نہیں ہے تو دل میں اس کو بُرا سمجھے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

اس اصولی بات پر اسلام کے علمبرداروں کے درمیان اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ اختلاف اس بات پر ہوتا ہے کہ بزور طاقت منکر کو مٹانے کی جو شرائط ہیں، آیا فلاں شخص یا گروہ ان کو پوری کرتا ہے یا نہیں؟ اسی سوال کے جواب میں فکر و نظر کا اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

ایک گروہ اپنی ذاتی طاقت کے اندازے میں مبالغہ سے کام لیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ وہ بزور طاقت منکر کو مٹانے پر قادر ہے کیوں کہ فلاں موقع پر اس نے شراب خانے کو تہس نہس کر دیا تھا یا رقص و سرود کی کسی محفل کو منعقد نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا کہ اس کی اس کارروائی سے، پرانے اور چھوٹے شراب خانے کی جگہ پر نیا اور بڑا شراب خانہ بن گیا جس میں روزانہ رقص و سرود کی محفلیں سجائی جاتی ہیں اور یہ لوگ اس کو توڑنے پر قادر نہیں ہیں۔

اس کے بالمقابل ایک دوسرا گروہ خود کو اپنی اصل طاقت سے کہیں زیادہ کمزور اور ضعیف سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ زبان و بیان کے ذریعہ بھی منکر پر نکیر کرنے کی ہمت، حوصلہ اور استطاعت اپنے اندر نہیں پاتا۔

ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک تیسرا گروہ متوسطین کا ہے جو معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرتا ہے، مفاسد اور مصالح کا موازنہ کرتا ہے۔ نفع و نقصان کا میزانیہ تیار کر کے، یہ دیکھتا ہے کہ انکار منکر سے داعیان اسلام اور اسلام کو بحیثیت مجموعی فائدہ ہوا ہے یا نقصان؟ حالات ان کے حق میں سازگار ہوئے ہیں یا ناسازگار؟ اسلام اور اہل اسلام، عوام الناس کی امیدوں کا مرکز بنے ہیں یا نفرت کا؟ اس کے بعد فیصلہ کرتا ہے کہ اس وقت اور ان حالات میں ہم کس مرحلے میں ہیں۔

بعض مخلصین یہ اشکال پیش کرتے ہیں کہ ہم اہل بدعت کے ساتھ کس طرح تعاون کریں اور ان کی بدعتوں سے کس طرح صرف نظر کریں اور کیوں کریں؟ جب کہ اہل بدعت سے قطع تعلق کا ہمیں اللہ نے حکم دیا ہے۔

اس اشکال کا حل یہ ہے کہ ساری بدعات ایک جیسی نہیں ہوتیں، ان میں بھی فرق مراتب ہوتا

ہے۔ اور بعض بدعتیں تو یقیناً اپنے حاملین کو کفر بَواح تک لے جاتی ہیں جب کہ بعض بدعتیں ایسی نہیں ہوتیں۔ بعض بدعتیں واضح اور صریح ہوتی ہیں جن کے بدعت ہونے پر امت کا سواد اعظم متفق ہے اور بعض کے بدعت ہونے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔

اسی طرح اہل بدعت کے درمیان بھی فرق مراتب ہوتا ہے۔ بعض بدعت کے تابع اور اس پر عمل کرنے والے ہوتے ہیں اور بعض بدعت کے ایجاد کرنے والے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کرنے والے ہوتے ہیں۔

ان سب کے ساتھ ایک جیسا معاملہ کرنا حکمت تبلیغ کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ اس شرعی قاعدے کے بھی خلاف ہوگا جسے فقہاء نے اَھوَنُ البَلِیَّتَینِ، اَھوَنُ الشَّرَّینِ اور اِرتِکَاب أخَفُ الضَّرَرَین کا نام دیا ہے۔

اس لئے داعیان بدعت کے مقابلہ میں بدعتی کے ساتھ تعاون جائز ہے۔ یہی نہیں، بلکہ متشدد اور متعصب کافر کے مقابلے میں غیر متعصب کافر سے تعاون، تحالف، جائز ہی نہیں بلکہ ضرورت بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد قریش کے مقابلے میں، قبیلہ بنو خزاعہ سے حلیفانہ معاہدہ کیا تھا۔

ایرانیوں اور رومیوں کی جنگ میں جب ایرانی، رومیوں کو شکست دے کر، شام و فلسطین کے علاقوں پر قابض ہوگئے تو مشرکین مکہ نے جشن منایا، اور مسلمان پریشان و غم زدہ ہوگئے۔ کیوں کہ مشرکین مکہ ایرانیوں کے غلبے کو اپنے مفاد میں سمجھتے تھے۔ اور مسلمانوں کی نظر میں ایرانیوں کا غلبہ، اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف، اور مصیبت و رکاوٹ کا پیش خیمہ تھا۔ اسی اثناء میں سورہ روم کی پانچ ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں اللہ تعالیٰ نے چند سالوں کے اندر، رومیوں کے دوبارہ غلبہ کی خوش خبری مسلمانوں کو دی تھی۔ مشرکین مکہ نے ان آیتوں کا مذاق اڑایا اور اُبی بن خلف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط لگائی کہ اگر دس سال کے اندر، رومی غالب اور ایرانی مغلوب

ہو گئے تو میں تم کو سو اونٹ دوں گا۔ بصورت دیگر، تمہیں مجھے سو اونٹ دینے ہوں گے۔ حضرت ابو بکرؓ نے یہ شرط قبول کر لی اور مقررہ مدت کے اندر اللہ کے حکم سے رومی غالب، اور ایرانی مغلوب ہو گئے تو حضرت ابو بکرؓ نے، حضور ﷺ کی اجازت سے، شرط کے سو اونٹ وصول کر کے، صدقہ کر دیا۔ آیتیں ملاحظہ ہوں:

الٓمّٓ ● غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ● فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۭ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ● بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ● (الروم : ا-۵)

"رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے اور مغلوب ہونے کے بعد، چند سال کے اندر وہ پھر غالب ہو جائیں گے۔ فیصلہ پہلے بھی اللہ کا تھا اور بعد میں بھی۔ اور وہ دن وہ ہو گا جب کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے، اللہ مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہ زبردست اور رحیم ہے۔"

اس واقعہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ بعض کافر زیادہ شدید اور سخت ہوتے ہیں اور بعض کافر کم شدید بلکہ نرم ہوتے ہیں۔ اور کچھ کفار، بعض کفار کے مقابلے میں مسلمانوں سے زیادہ قریب اور نرم ہو سکتے ہیں اور بعض کفار بہت دور اور سخت۔

اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ سخت کافر کے مقابلے میں نرم، کافر کے غلبے کو اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے پیش نظر، وقتی اور عبوری مدت کے لئے، گوارا کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تائید کی جا سکتی ہے اور ضرورت متقاضی ہو تو سخت کافر کو شکست دینے کے لئے نرم کافر سے حلیفانہ معاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

کلمہ گو کی تکفیر سے اجتناب:

اہل اسلام کی وحدت کو توڑنے، ان کو مختلف گروہوں اور فرقوں میں تقسیم کرنے، ان کو حقیر اور

بے وزن بنانے میں سب سے بڑا کردار مسلمانوں کی باہمی تکفیر نے ادا کیا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ نبی کریم ﷺ نے ایمان والوں کی تکفیر سے نہایت سختی کے ساتھ منع و خبردار کیا تھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ:

إذا قال الرَّجُلُ لأخِيهِ : يَا كَافِرُ ، فَقَدْ بَآءَ بِهَا اَحَدُهُمَا ، فَإِنْ كَانَ كَمَا قَالَ ، وَ اِلَّا رَجَعَتْ عَلَيْهِ . (متفق عليه)

"اگر کسی شخص نے اپنے مسلمان بھائی کو "اے کافر" کہا تو ان دونوں میں کوئی ایک کافر ہوا پس جس کو کافر کہا، اگر وہ کافر نہیں ہے تو کافر کہنے والے نے کفر کا ارتکاب کیا۔"

مَنْ دَعَا رَجُلاً بِالْكُفْرِ ، أَوْقَالَ : يَا عَدُوَّا اللّٰهِ ، وَلَيْسَ كَذَالِكَ ، إِلَّا حَارَ عَلَيْهِ . (متفق عليه ، عن ابی ذرؓ)

"حضور نے فرمایا کہ جس کسی نے کسی مسلمان کو کافر یا اللہ کا دشمن کہہ کے پکارا، اور وہ ایسا نہیں ہے، تو کہنے والا کافر ہو گیا۔"

مَنْ رمىٰ مُؤْمِناً بِكُفْرٍ ، فَهُوَا كَقَتْلِهٖ . (متفق عليه)

"حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس کسی نے کسی مؤمن پر کفر کی تہمت لگائی تو گویا اس نے اس کو قتل کر دیا۔"

اس لئے اسلامی بیداری کے حاملین پر فرض ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ کے قائل کو کافر نہ کہیں۔ کیوں کہ یہ بات احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا، اس نے اپنی جان و مال اور عزت کو محفوظ کر لیا۔ اور اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ حساب اللہ کے ذمہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کے ظاہر قول پر اعتماد کر کے حکم لگائیں گے اور اس کے باطن کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں گے۔

حضرت اسامہؓ بن زید کے قصے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ انہوں نے ایک معرکہ میں ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا جس نے لڑائی کے دوران کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا تھا محض اس خیال سے کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لئے ایسا کیا ہے۔ لیکن جب حضور ﷺ کو اس واقعہ کی

خبر ہوئی تو آپ حضرت اسامہؓ پر غضبناک ہوگئے اور فرمایا کہ : هَلْ شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِهِ "کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہم حضور ﷺ کی قائم کی ہوئی اس حد کی حفاظت کریں اور کسی بھی حال میں اسے نہ توڑیں۔ اور مسلمانوں کے گناہوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے ان کی ہرگز ہرگز تکفیر نہ کریں۔ کیوں کہ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

ثَلَاثٌ مِنْ أصل الإيمان : الكفُّ عَمَّنْ قَالَ: لَا إِلٰه اِلَّا اللّٰهُ، لَا نكفرهُ بِذَنْبٍ وَلَا نُخْرِجُهُ مِنَ الْاِسْلَامِ بِعملٍ .(ابو داؤد ، كتاب الجهاد)

"تین باتیں ایمان کی اصل میں شمار ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ مسلمان کے اوپر ہاتھ نہ اٹھائیں گناہ کی وجہ سے ان کو کافر نہ کہیں اور برے عمل پر ان کو اسلام سے خارج نہ کریں۔"

ایک اور حدیث میں حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ:

كُفُّوا عَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ، لَا تُكَفِّرُوهُمْ بِذَنْبٍ ، مَنْ كَفَرَ اَهْلَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَهُوَا اِلَى الْكُفْرِ اَقْرَبُ . (الطبرانى فى الكبير)

"لا الہ الا اللہ کا اقرار کافی ہے۔ تم ان کے گناہ پر تکفیر نہ کرو۔ جو ان کی تکفیر کرے تو وہ ان سے زیادہ کفر کے قریب ہے۔"

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی عبارت سے یا الفاظ سے کفر کا اظہار ہو رہا ہو تو بھی اس کو اس وقت تک کافر نہیں کہنا چاہئے جب تک کہ اس سے اس بات کی تصدیق نہ کر لی جائے کہ آیا اس کی اس عبارت اور الفاظ کا منشاء و مراد وہی ہے جو ہم سمجھ رہے ہیں۔ (ایثار الحق علی الخلق، صفحہ: ۳۹۲، ۳۹۴)

اور اس کے مقابلے میں آج اہل اسلام کا حال یہ ہے کہ وہ دوسروں کے الفاظ میں اپنا مفہوم پہلے داخل کرتے ہیں اور پھر ان پر ضال و مضل اور کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں خواہ ان الفاظ کا قائل ان کے نکالے ہوئے معنیٰ سے اپنی برأت کا لاکھ اعلان کرے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر، آج برصغیر کا

حال یہ ہے کہ یہاں ایک گروہ دوسرے گروہ کو ضال و مضل، گمراہ اور کافر قرار دینے کے لئے مخالف کی، عبارتوں میں تحریف کرتا ہے، ان کو سیاق و سباق سے نکال کر، ان میں کتر بیونت کر کے اپنا مفہوم داخل ہوتا ہے۔ ناممکن سے "نا" کو نکال کر ممکن بناتا ہے اور توجہ و یاد دہانی کی تکرار کے باوجود نہ اپنی غلطی تسلیم کرتا ہے اور نہ فتوے کو واپس لیتا ہے۔

خوارج، جن کی ضلالت پر واضح نص موجود ہے، صحابہؓ، تابعینؒ اور ائمہ کا ان کی ضَلالت پر اجماع ہے۔ حضرت علیؓ نے ان سے اپنے زمانے میں قتال بھی کیا۔ ان سب کے باوجود، سب نے ان کو مسلمان ہی کہا۔ اور کسی نے بھی ان کو کافر نہ کہا۔

صحابہؓ و سلفؒ نے جب خوارج جیسے گمراہ فرقے کو کافر نہیں کہا تو کسی کیلئے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے وہ کسی دوسرے گروہ کو کافر کہے جو کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کرتا ہو اور خود کو مسلمان کہتا اور لکھتا ہو۔

اہل اسلام کا خون، مال اور عزت باہم ایک دوسرے پر حرام ہے۔ جسے حضور نے حجۃ الوداع کے موقعے پر اس طرح بیان کیا ہے:

اِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِىْ بَلَدِكُمْ هٰذَا فِىْ شَهْرِكُمْ هٰذَا .

"حقیقت یہ ہے کہ تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزت، باہم ایک دوسرے مسلمان پر اسی طرح حرام ہے جیسے آج کا یہ دن تم پر حرام ہے اور یہ مہینہ حرام ہے اور یہ شہر حرام ہے۔"

مسلم کون ہے اس کی وضاحت حضور ﷺ نے اس طرح فرمائی۔

مَنْ صَلّٰى صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَ أَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَهُوا مُسلمٌ لَهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ.

"یعنی وہ جو ہماری طرح نماز پڑھے، ہمارے قبلے کا رخ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے۔ وہ مسلم ہے" اللہ و رسول نے اس کا ذمہ لیا ہے۔"

صحابہ کرام نے جنگِ جمل اور جنگ صفین میں باہم قتال کیا۔ اس کے باوجود وہ باہم مسلم ومؤمن تھے۔ اس قتال کی وجہ سے وہ مذموم گروہ بندی کا شکار نہیں ہوئے۔ اور نہ ہی انہوں نے اپنی اپنی مسجدیں الگ الگ بنائیں، نہ ہی ایک دوسرے کو کافر اور ضال ومضل کہا۔

باہم قتال کے باوجود، اللہ تعالیٰ نے سلف کو مؤمنوں کا دو گروہ کہا۔ جس میں کا ایک گروہ، دوسرے گروہ پر ظلم کرنے والا ہے اور دوسرے، اہل ایمان کو حکم دیا کہ تم اپنے ان دونوں بھائیوں کی مدد کرو۔ اور ان کے درمیان عدل کے مطابق صلح وصفائی کراؤ، اور جو فریق صلح سے انکار کرے تو تم انکار کرنے والے کے خلاف لڑو۔ یہاں تک کہ وہ بھی صلح پر تیار ہو جائے۔ اور جب دونوں فریق صلح کے لئے تیار ہو جائیں تو تم ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا کے، انہیں بھائی بھائی بنادو۔ یہی وہ کام ہے جس کے نتیجے میں، پوری امت اسلامیہ اللہ کی رحمت کی مستحق ہوگی۔ لیکن اگر باہم لڑنے والے صلح نہ کریں اور غیر جانب دار لڑنے والوں کے درمیان صلح کی کوئی کوشش نہ کریں تو پوری امت اللہ کی رحمت سے محروم ہو جائے گی۔ اور اللہ کے غضب سے دوچار۔ کیوں کہ اللہ ان مؤمنوں سے محبت کرتا ہے جو اس کے دین اور اس کی خوشنودی کے لئے، اس کی راہ میں اسی طرح مل جل کر لڑتے ہیں جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔

اس لئے مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ معمولی معمولی باتوں پر اپنی مسجدیں الگ نہ بنائیں۔ جمعہ و جماعت کی نماز ایک ساتھ مل کر ادا کریں۔ باہم دوست بنیں اور دشمنی ونفرت کو چھوڑ دیں۔ اور اگر ایک گروہ، دوسرے گروہ کے اندر، کوئی غلطی اور گمراہی دیکھتا ہے تو ہر ممکن طریقے سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے اور اگر اصلاح میں ناکامی ہو تو معاملہ اللہ کے سپرد کر دے۔ لیکن دعا اور اصلاح احوال کی جدوجہد کو ترک نہ کرے۔ کسی بھی حال میں اپنی مسجدیں الگ نہ بنائے۔ انہیں کے درمیان رہیں اور انہیں کے پیچھے نماز ادا کرتے رہیں۔ کیوں کہ صحابہ کرامؓ بھی اضطراری حالات میں اہل فسق وفجور اور بدعتی کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے اور اپنی نماز کو دہراتے نہیں تھے۔

علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ مبتدع کے پیچھے نماز جائز ہے، اس لئے ہمیں باہم مل کر جماعت کا اہتمام کرنا چاہئے اور باہم تشدد وتکفیر سے ہمیشہ بچنا چاہئے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہؒ ج: ۳ ص ۲۸۲۔۲۸۷)

لیکن اللہ، رسولؐ، صحابہ اور سلف صالحین کی محبت، اطاعت اور اتباع کا دعویٰ کرنے والے آج صحابہ وسلف کے راستے کو چھوڑ کر باہم گروہوں وفرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ اپنی اپنی مسجدیں الگ الگ بنالی ہیں۔ رفع یدین، آمین بالجبر، درود وسلام اور اقامت کے وقت بیٹھنے اور کھڑے ہونے کے فروعی تنازع کو لے کر، ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کی جان، مال اور عزت کو اپنے لئے حلال بنا لیا ہے۔ باہمی تمسخر، طعنہ، برے القاب، ظن، تجسس، غیبت، نجویٰ اور چغل خوری کا ارتکاب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے خلاف، پوری دیدہ دلیری کے ساتھ علی الاعلان، مسجد ومحراب سے کر رہا ہے۔ اور ذرہ برابر اسے احساس نہیں ہے کہ یہ وہ گناہ کے کام ہیں جس سے اللہ اور اس کے رسول نے سختی سے منع فرمایا ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ ان گناہوں سے توبہ نہ کریں وہ ظالم اور فاسق ہیں۔ اور ہماری اس حالت کی وجہ سے، اسلام اور امت مسلمہ، دونوں کی ساکھ مجروح ہو رہی ہے۔

اتحادملت کے لئے مطلوبہ اخلاقی اوصاف

اتحاد امت کی حفاظت پوری امت پر فرض ہے: اور باہمی تفرقہ واختلاف، سنگین جرم اور گناہ ہے۔ تفرقہ واختلاف سے بچنے اور اتحاد امت کے فرض کی تکمیل کے لئے فکر وفہم اور عمل کے کچھ مطلوبہ اوصاف ہیں جن کے بغیر امت، اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

اب تک کی بحث وگفتگو میں، ہم نے اتحاد امت کے لئے، فکر وعلم کے ان مطلوبہ اوصاف کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جن کا علم وفہم اور جن پر عمل، امت کے ہر خاص وعام پر، اس کی

استطاعت کے مطابق نہایت ضروری ہے کیوں کہ فکر وعمل کے ان مطلوبہ اوصاف کے بغیر، امت کا اتحاد، وجود میں نہیں آ سکتا۔

آئندہ مباحث میں ہم یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ اتحاد امت کے لئے مطلوبہ فکری وعلمی اوصاف کا حامل شخص بھی اتحاد امت کا حق ادا نہیں کرسکتا، جب تک کہ وہ ان چند اخلاقی اوصاف سے متصف اور ان پر پورے اخلاص کے ساتھ عامل نہ ہو۔ جس میں سب سے اہم اور پہلا اور بنیادی وصف، خدائے واحد کے لئے اخلاص وللّٰہیت ہے، حق اور سچائی کے لئے ساری دنیا سے لڑنے اور کٹ جانے کی آمادگی وتیاری ہے۔ نفس پر قابو پانے کے لئے اس کے ساتھ جہاد اور خواہش نفس کی اتباع سے آزادی اور دوسروں کی خواہش نفس کی پیروی سے نجات ہے۔

بعض اوقات افراد اور جماعتوں کے درمیان، ظاہری طور پر جو فکری وعلمی اختلافات پائے جاتے ہیں، اکثر وبیشتر ان کی تہہ میں، خود پسندی اور خواہش نفس کی اتباع موجود ہوتی ہے جو ان کو اللہ کے پسندیدہ راستے، اتحاد واتفاق سے ہٹاتی رہتی ہے۔

نہایت افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ آج مختلف اسلامی تحریکوں، جماعتوں اور اداروں کے مابین یا ایک ہی جماعت اور ادارے کے مختلف شعبوں کے درمیان یا مختلف جماعتوں کے قائدین کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں اور جنہیں اسلام اور جماعت کے مصالح کا خوبصورت نام دے دیا جاتا ہے، وہ اکثر وبیشتر حالات میں شخصی وذاتی مصالح سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ حقیقی اختلاف تو دراصل اس امر میں ہوتا ہے کہ لیڈر کون؟ صدر کون ہو؟ اقتدار جاہ اور عہدہ کی یہ حرص، دین، اور اسلامی تحریکات کے اندر جو فساد برپا کرتی ہے، وہ اس فساد سے بڑھ کر ہوتی ہے جو دوبھوکے بھیڑیئے، بکریوں کے کسی ریوڑ میں مچاتے ہیں۔ جیسے نبی اکرم ﷺ نے اس طرح بیان کیا ہے ''کسی شخص کی دینی شرف کی آرزو، بزرگی کی طلب اور مال کی حرص (اس دنیا میں) جو فساد برپا کرتی ہے، وہ اس فساد سے بڑھ کر ہوتی ہے جو دوبھوکے بھیڑیئے بکریوں کے ریوڑ میں

مچاتے ہیں۔'' (احمد، ترمذی)

اسی لئے خدا اور رسول نے، مؤمن کی اسلامی تربیت کا مقصود ومنتہا، مخلوق کی رضا کے مقابلے میں، خالق کی رضا، دنیا کی منفعت کے مقابلے میں فلاح آخرت، اور انسانوں سے حاصل ہونے والے نفع کے مقابلے میں اللہ سے ملنے والی نعمتوں کو قرار دیا ہے۔ اور مؤمن کو اس بات سے خبردار کیا ہے کہ اس دنیا میں اس کے علم اور جدوجہد کا مقصود حقیقی، کھلی یا چھپی ہوئی ذاتی یا طبقاتی عزت اور شہرت کا حصول نہ ہو بلکہ اس کے علم اور عمل کا مقصد رضائے الٰہی اور آخرت ہو۔

یہ بات صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے دوزخ میں جانے والے ریاکار اور اللہ پر جھوٹ باندھنے والے لوگ ہوں گے۔ یعنی وہ لوگ جو نیک عمل اس طرح دکھا کر کرتے ہیں کہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ وہ اللہ کے لئے عمل کر رہے ہیں جب کہ حقیقت میں وہ اپنی ذاتی شہرت اور نفس کے لئے عمل کرتے ہیں خواہ وہ اللہ کی راہ میں جان ومال سے جہاد کرنے والے مجاہد وشہید ہوں یا دین اسلام کی تعلیم دینے والے اساتذہ اور علماء ہوں یا اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے والے تاجر اور امراء ہوں۔

اس کے مقابلے میں اللہ ورسول ﷺ نے ان لوگوں کی بہت تعریف کی ہے جنہوں نے اللہ ورسول ﷺ کی اطاعت اور اس کے دین کی نصرت میں، اپنے خون کا آخری قطرہ اور اپنی عمر کا سب سے قیمتی حصہ، اس حال میں خرچ کر دیا کہ کوئی ان کو دیکھنے اور تعریف کرنے والا نہ تھا۔ چنانچہ زید بن اسلمؓ بیان کرتے ہیں کہ ''ایک بار حضرت عمرؓ مسجد جانے کے لئے باہر تشریف لائے تو، حضرت معاذؓ کو قبر رسول اللہ کے پاس روتے ہوئے دیکھا تو پوچھا؟ کیوں رو رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا ہے کہ معمولی ریا بھی شرک ہے۔ اللہ، ایسے چھپے ہوئے متقی اور نیکوکار لوگوں سے یقیناً محبت کرتا ہے جو اگر غائب ہوجائیں تو ان کی تلاش نہ ہو، اور اگر حاضر ہوں تو پہچانے نہ جائیں، ان کے قلوب، ہدایت کے روشن چراغ کے مانند ہیں،

وہ زمین کے غیر معروف تاریک حصوں میں سے نکلیں گے۔''

(رواہ الحاکم فی المستدرک، کتاب الایمان ۱/ ۴، وقال صحیح۔ ووافقہ الذہبی وایدہ المنذری)

حقیقی مسلم تو اللہ کا بندہ ہوتا ہے، اپنی ذات کا بندہ نہیں ہوتا۔ اسے جس جگہ عمل کے لئے لگا دیا جائے یا جو ذمہ داری سپرد کر دی جائے اور جہاں کہیں اس کی توجہ مرکوز کر دی جائے ۔ آگے یا پیچھے۔ قائد کی پوزیشن میں یا سپاہی کی حیثیت میں، وہ ہر جگہ، دنیا، منصب اور جاہ کی طلب سے بے نیاز ہو کر اپنا فرض انجام دیتا رہتا ہے۔ کیوں کہ اللہ اور اس کے رسول نے اسی کی تعلیم دی ہے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ'' ہلاک و نامراد ہو دنیا کا بندہ۔ تباہ و برباد ہو درہم کا بندہ۔ ہلاک ہو پیٹ کا بندہ۔ اگر دیا جائے تو خوش ہو جائے اور نہ دیا جائے تو ناراض۔ ہلاک اور ذلیل ہو ایسا شخص کہ جب اس سے غلطی ہو جائے تو توبہ نہ کرے۔'' (اس کے مقابلہ میں) '' خوشخبری اور بشارت ہے اس بندے کیلئے جس کے بال و بدن اللہ کی راہ میں پراگندہ اور غبار آلود ہیں۔ دونوں پیر کیچڑ میں لت پت ہیں، جو اسی حال میں اپنے گھوڑے کی لگام تھامے تیار کھڑا ہے۔ اگر اسے فوج کے اگلے حصے میں ڈیوٹی ملی تو وہاں لڑ رہا ہے، اور اگر فوج کے پچھلے حصے میں لگا دیا گیا تو وہاں بھی لڑ رہا ہے۔'' (بخاری عن ابی ہریرہؓ)

اللہ کی ہزاروں لاکھوں رحمتیں سایہ فگن ہوں حضرت خالد بن ولیدؓ پر کہ جب وہ فوج کے سپہ سالار اور قائد بنائے گئے تو اس حیثیت میں، اللہ کی نصرت و مدد سے، ان کے ہاتھوں پر، اسلام اور اسلامی مملکت کے لئے خیر کثیر کا ظہور ہوا۔ اور جب عین حالت میں جنگ میں معزول کر دئے گئے اور ان کی جگہ پر، ابوعبیدہؓ، الجراحؓ کو ان کا قائد بنا دیا گیا تو ایک معمولی سپاہی کی حیثیت میں، بہترین مجاہد، ناصح اور مشیر کا کردار بھی ادا کیا۔ مومن صادق ایسے ہی ہوتے ہیں۔

مسلمانوں اور اسلامی جماعتوں کے اختلاف کے پیچھے، اکثر و بیشتر حالات میں کسی شخص یا جماعت، کسی مسلک یا ملک کے لئے مذموم تعصب کارفرما ہوتا ہے اگر تمام لوگ عدل و انصاف کا

دامن تھام لیں، خود کو حق کے لئے وقف کر دیں اور اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے، یہ اعلان کر دیں کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت، سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے تو امت مسلمہ کے باہمی اختلاف ختم ہو جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ شرک کی ایک قسم، خواہش کی اتباع ہے اسی لئے سلف وصالحین کہا کرتے تھے کہ زمین پر جن معبودوں کی عبادت کی جاتی ہے، ان میں سب سے بڑا معبود، خواہش نفس ہے جس کی اتباع صرف عوام ہی کو نہیں بلکہ علماء کو بھی، حق کے راستے سے ہٹاتی اور گمراہ کرتی رہتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے سورہ جاثیہ، آیت ۲۳ میں یوں بیان کیا ہے۔'' کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر بھی غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنالیا ہے اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اسے ہدایت دے؟ کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے؟'' (جاثیہ: آیت نمبر ۲۳)

شخصی، گروہی اور مسلکی عصبیت سے آزادی:

کسی شخص کا دین، اللہ کیلئے اس وقت تک خالص نہیں ہو سکتا اور وہ حق وانصاف کا علمبردار نہیں ہو سکتا جب تک وہ شخصی اور مسلکی تعصب سے آزاد نہیں ہو جاتا۔ اور مسلکی و شخصی عصبیت سے آزادی کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنی رائے کی کمزوری وخطا کے واضح ہو جانے کے باوجود غرور نفس اور احساس برتری کے جذبے سے یا علم کی کمی اور غلطی کی تہمت کے خوف سے وہ اپنی کمزور رائے پر مضبوطی سے جم جائے اور اصرار کے ساتھ اس کی مدافعت کرے۔ یہ وہ تعصب ہے جو عجب نفس اور خود پسندی پر دلالت کرتا ہے جسے حضور ﷺ نے ہلاکت میں سب سے زیادہ شدید بتایا ہے۔ (اعجاب المرءِ بِنَفْسِهِ وَهِيَ اشدهنَّ)

اللہ تعالیٰ امام شافعیؒ پر اپنی رحمتیں نازل کرے اور ان سے راضی ہو، انہوں نے کتنی سچی بات

کہی ہے کہ اللہ کی قسم! میرے نزدیک اصل چیز حق کی وضاحت اور اس کا اظہار ہے خواہ وہ میری زبان سے نکلے یا میرے مقابل ومخالف کی زبان سے، اور حق ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔''

متعصب کا حال اس شخص کی مانند ہوتا ہے جو شیشے کے مکان میں اکیلا رہتا ہے۔ جو دائیں بائیں، ہر سمت اور ہر جگہ میں خود ہی کو دیکھتا ہے۔ مختلف نقطۂ نظر اور کثرت رائے کی موجودگی کے باوجود، وہ ان کو لائق توجہ نہیں سمجھتا۔ وہ اپنی عقل کے دریچے دوسرے نقطۂ نظر کے لئے کھولتا ہی نہیں۔ وہ اپنے زعم میں خود کو سب سے عقل مند، سب سے زیادہ ذی علم اور سب سے زیادہ قوی دلیل پر مبنی رائے کا حامل سمجھتا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے پاس وہ عقل ہی نہیں ہے جو اجتہاد کر سکے، وہ علم ہی نہیں ہے جو دوسروں سے بے نیاز کردے اور وہ دلیل ہی نہیں ہے جس پر وہ قانع ہو جائے۔

ان میں سے بعض متعصبین کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے دلائل اور نقطۂ نظر کو سننے سمجھنے اور غور کرنے سے پہلے اس کی تردید کر دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے تعصب کی مذمت کی ہے۔ اس کو نفس کی اتباع کے بعد، حق کی راہ کی دوسری بڑی رکاوٹ وگمراہی قرار دیا ہے۔ اور متعدد مقامات پر اہل ایمان کو اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے بارے میں قرآن میں فرمایا کہ '' جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے، اس پر ایمان لاؤ، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ہمارے یہاں نازل ہوئی ہے اور اس کے بعد جو کچھ نازل ہوا ہے، وہ اس کا انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق وتائید کر رہا ہے۔ جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی۔'' (البقرہ:۹۱)

مشرکین کے بارے میں فرمایا کہ '' اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کئے ہیں، ان کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا، اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہِ

ہدایت نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کئے چلے جائیں گے؟ یہ لوگ جنہوں نے بغیر سوچے سمجھے، خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے انکار کر دیا ہے ان کی حالت بالکل ایسی ہے جیسی چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے۔ ہانک پکار کی آواز کے علاوہ یہ کچھ سنتے اور سمجھتے نہیں۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اس لئے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی''۔ (البقرہ:۱۷۰۔۱۷)

ملی اتحاد کی راہ میں بعض اوقات مسلک ومشرب کا تعصب بھی سدراہ بنتا ہے جب کہ اس سے وابستہ شخص یا گروہ اپنے مسلک کے ائمہ اور ان کے علم وفہم کو خطا ونسیان سے پاک تصور کرتا ہے۔ اور تقلید محض کو واجب قرار دیتا ہے۔ اس واضح حقیقت اور علم کے باوجود کہ اللہ ورسول کے مقرر کردہ واجبات کے علاوہ، کسی پر کوئی دوسری چیز واجب نہیں ہے۔ اور اللہ ورسول نے بے سوچے سمجھے کسی بھی شخص کی اندھی اتباع کو واجب نہیں کیا ہے۔ خواہ وہ علم وفضل کے اعتبار سے بلند ترین مقام پر فائز ہی کیوں نہ ہو۔ یہ تقلید محض دین اسلام میں وہ غلو ہے جو یہود ونصاریٰ کے غلو کے مانند ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے علماء اور اللہ والوں کو خدا کا درجہ دے دیا تھا۔

اِتَّخَذُوا اَحبَارَھُم وَ رُھبَانھم اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ.

جس کی صحابہ، سلف صالحین اور امت کے علماء محققین نے مخالفت کی ہے۔ اور جس سے چاروں ائمہ ہدیٰ نے بھی منع فرمایا ہے۔

'' چنانچہ امام عزالدین بن عبدالسلامؒ فرماتے ہیں کہ دور اول میں ہمیشہ لوگ، مسلک کی قید کے بغیر علما سے سوالات کرتے تھے اور وہ ان کے جوابات دیتے تھے یہاں تک کہ مسالک کے متعصب مقلدین کا زمانہ آیا۔ اور دلیل قرآن وسنت کے اعتبار سے، اپنے مسلک کی کمزوری واضح ہو جانے کے باوجود بھی، ایک متعصب شخص اپنے مسلک کے امام کی تقلید اس طرح کرتا ہے گویا وہ نبی ہے! اس کی یہ روش حق وصواب سے دور اور اس کے خلاف ہے جس سے کوئی عقل وعلم والا راضی نہیں ہے۔'' (حجۃ اللہ البالغہ جلد:۱)

'' امام ابوشامہؒ کہتے ہیں کہ علماء وفقہا کو کسی ایک امام کے مسلک کی تقلید کا پابند نہیں ہونا چاہئے بلکہ مختلف فیہ مسائل میں جو دلائل کتاب وہ سنت کے اعتبار سے قوی تر ہوں، انہیں صحیح سمجھنا چاہئے اور عملاً ترجیح بھی دینا چاہئے۔ کیوں کہ امام شافعیؒ سے بالکل صحیح طریقے سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ دوسروں کی تقلید محض کے ساتھ اپنی تقلید محض سے بھی منع فرماتے تھے۔'' (حجۃ اللہ البالغہ، جلد:۱)

'' یہ بات تعجب کی نہیں ہے بلکہ یہ معلوم ومعروف حقیقت ہے کہ عدل وانصاف کے حامل محقق علماء، دلائل قرآن وسنت کے اعتبار سے، اپنے مسلک کی کمزوری واضح ہو جانے کے بعد، دوسرے اقویٰ مسلک کو ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ امام قاضی ابوبکر بن عربی المالکیؒ نے زمین کی پیداوار کے مسئلہ میں، مالکی مسلک کے مقابلے حنفی مسلک کو ترجیح دی، کیوں کہ حنفی مسلک کے دلائل قوی اور اقرب الی الکتاب والسنۃ تھے۔ اسی طرح امام نوویؒ اور امام شیرازی کا بھی عمل اس پر تھا۔''

(حجۃ اللہ البالغہ، جلد:۱)

'' امام ابوحنیفہؒ کے خلفاء، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، اور امام زفرؒ نے لاتعداد مسائل میں اپنے استاد کے فتوے سے اختلاف کیا۔ اور یہی حال امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے خلفاء کا تھا کہ انہوں نے درجات کے فرق کے ساتھ کثیر مسائل میں، اپنے اپنے ائمہ کے مسلک سے اختلاف کیا۔'' (حجۃ اللہ البالغہ، جلد:۱)

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ تحریف دین کے اسباب میں سے ایک سبب نبی معصوم کے علاوہ غیر معصوم انسانوں کی تقلید محض ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ علمائے امت میں سے کوئی عالم اجتہاد کرتا ہے تو اس کے مقلدین، اس کے اجتہاد کو یقینی طور پر حق وصواب قرار دے دیتے ہیں اور اس کے مقابلے میں صحیح حدیث کو بھی رد کر دیتے ہیں۔ یہ وہ تقلید نہیں ہے جس پر امت نے اتفاق کیا ہے کیوں کہ امت نے مجتہدین کی جس تقلید پر اتفاق کیا ہے وہ یہ ہے کہ تقلید کے ساتھ مجتہد کے بارے میں یہ عقیدہ بھی ہو کہ اس سے خطا وصواب دونوں سرزد ہو سکتے ہیں۔ اور یہ عزم وارادہ بھی

کہ جب بھی اس مسئلے میں تقلید کے خلاف کوئی صحیح حدیث مل جائے گی تو تقلید کو چھوڑ کر حدیث کی اتباع کی جائے گی۔ ورنہ حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق، یہود ونصاریٰ کی طرح، اپنے علماء مجتہدین کو اربابا من دون اللہ بنانے کا جرم، تقلید محض کرنے والوں پر لازم آئے گا۔'' (حجۃ اللہ البالغہ، جلد:۱ص: ۲۶۳، ۲۶۴)

'' علامہ ابن تیمیہؒ سے ایک ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو بعض مسائل میں اپنے فقہی مسلک کو چھوڑ کر، دوسرے مسلک پر عمل کرتا تھا۔ تو اس کے اس عمل پر اس کے اہل مسلک اعتراض کرتے تھے۔''

'' علامہ ابن تیمیہؒ نے جواب دیا کہ اگر ایک شخص امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ یا امام شافعیؒ یا امام احمد بن حنبلؒ کا متبع ہے اور بعض مسائل میں وہ دیکھتا ہے کہ دوسرے امام کا مسلک، اس کے امام سے قوی ہے جس کی اتباع وہ کر رہا ہے تو ایسی صورتِ حال میں اس کا ان مسائل میں دوسرے امام کے اقویٰ مسلک پر عمل کرنا احسن ہے۔ اس سے اس کے دین اور اس کی عدالت میں بلا اختلاف کوئی خرابی نہیں ہوتی بلکہ حق پر عمل کے اعتبار سے اولیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے نزدیک اس متعصب مقلد کے مقابلے میں زیادہ پسندیدہ اور احسن ہے جو ہر حال میں کسی ایک ہی امام کے مسلک کی تقلید کرتا ہے۔ ایسا متعصب مقلد جاہل وگمراہ ہے۔''

کچھ مثالوں کے بعد لکھتے ہیں۔

'' جو کوئی ائمہ کا معتقد اور ان سے محبت کرنے والا ہے تو اس کے لئے احسن عمل یہ ہے کہ ہر مسئلے میں وہ اس امام کے فتوے کی اتباع کرے، جسے وہ کتاب وسنت کے قریب پاتا ہے۔ اس قسم کا عمل مذبذب یا مذموم نہیں ہے جس میں دلیل اور اخلاص کے ساتھ ایک امام کی تقلید کو چھوڑ کر، دوسرے امام کے فتوے کی تقلید کی جائے۔ دین میں مذبذب اور مذموم وہ عمل ہے جس میں عامل کبھی اہل ایمان کے ساتھ رہ کر ان کی تقلید کرے اور کبھی کفار کے ساتھ رہ کر ان کی تقلید کرے۔

ایسے ہی عامل کو اللہ و رسول نے مذبذب اور منافق کہا ہے‘‘۔

مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ (النساء:۱۴۳)

’’یہ کفر اور ایمان کے درمیان ڈانوا ڈول ہیں نہ پورے اس طرف ہیں اور نہ پورے اس طرف۔‘‘

مزید آگے لکھتے ہیں:

’’بالقصد متعین طور سے تمام ائمہ کو چھوڑ کر کسی ایک امام کی تقلید محض کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی تمام صحابہؓ کو چھوڑ کر، کسی ایک متعین صحابی کی اتباع و تقلید کو اپنے اوپر لازم کر لے۔ اور یہ عمل بالکل ویسا ہی ہے جیسے خارجیوں نے متعین طور سے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی اتباع سے انکار کیا ہے۔ تو یہ عمل خواہش نفس کی پیروی کرنے والوں کا ہے۔ جس کی مذمت قرآن و سنت اور اجماع سے ثابت ہے کہ اس قسم کے تمام لوگ اس شریعت اور منہاج سے نکل گئے ہیں جس پر اللہ نے اپنے رسول کو مبعوث کیا تھا۔ پس وہ ہر شخص جو تمام ائمہ کو چھوڑ کر متعین طور پر کسی ایک امام کی عصبیت کا شکار ہو جائے وہ انہیں گمراہ فرقوں کے مشابہ ہوگا خواہ یہ عصبیت امام مالکؒ، امام ابوحنیفہ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ یا ان کے علاوہ کسی اور کیلئے ہو۔‘‘

(فتاویٰ ابن تیمیہؒ، جلد: ۲۲، ۲۴۸، ۲۵۴)

تقلید محض اور تعصب، غلط اور مذموم ہے:

اگر ائمہ اور ان کے فقہی مسالک کے حق میں تقلید محض اور تعصب، غلط اور مذموم ہے تو بالکل اسی طرح ائمہ اور ان کے فقہی مسالک کی تقلید کے خلاف بھی تعصب غلط اور ناپسندیدہ ہے۔

جس طرح یہ بات مجموعی اور کلی حیثیت میں درست نہیں ہے کہ پوری امت پر، کسی ایک امام کی تقلید محض واجب ہے، اس طرح یہ بات بھی کلیہ کے طور پر غلط، غیر معقول اور ناقابل تسلیم ہے کہ پوری امت پر تقلید بالکل حرام ہے اور اجتہاد ہر خاص و عام، عامی و عالم کے لئے درست ہے۔

کیوں کہ تمام ائمہ مجتہدین جن کی تقلید امت کرتی ہے، سب نے بالاتفاق یہ فرمایا ہے کہ:

وَلَايَحِلُّ لِأَحَدٍ أَنْ يَعْمَلَ بِقَوْلِنَا مَالَمْ يَعْلَمْ مِنْ أَيْنَ قُلْنَاهُ ۔

’’ہمارے فتوے کی دلیل اور ماخذ کے علم کے بغیر، کسی شخص کے لئے اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔‘‘

یا مثلاً: إِذَا صَحَّ الْحَدِيْثُ فَهُوَ مَذْهَبِيْ.

’’جب ہمارے فتوے اور مسلک کے خلاف کوئی حدیث صحیح مل جائے تو اس پر عمل کرنا ہی ہمارا مسلک ہے۔‘‘

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اپنی کتاب رفع الملام عن ائمة الأعلام کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

’’اللہ، رسول ﷺ اور مؤمنین کی وفاداری کے بعد مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ ان ائمہ کرام کے وفادار رہیں اور ان کی اتباع کریں جو انبیاء کے وارث ہیں۔ جن کو اللہ نے ستاروں کے مانند بنایا ہے، جن سے لوگ بحر و بر کی تاریکی میں روشنی حاصل کرتے ہیں اور جن کی تحقیق اور اجتہاد کے حق ہونے پر امت (کی اکثریت) کا اجماع ہے۔‘‘

مزید بحث کے بعد پھر فرمایا کہ:

یہ رسول کی امت میں اس کے خلیفہ ہیں اور اس کی مردہ سنتوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ انہی کے ذریعے اور انہی کی کوششوں سے کتاب الٰہی اس دنیا میں قائم ہوئی اور اس کتاب کے ذریعہ اور اسی کتاب میں غور و فکر اور اس کی اتباع سے، انہیں اس دنیا میں یہ بلند مقام اور شرف حاصل ہوا۔ انہیں کے ذریعے کتاب الٰہی بولتی ہے اور کتاب الٰہی کے ذریعے اور اس کے حوالے سے یہ بولتے ہیں۔ یہ بات ہر خاص و عام کو معلوم ہونی چاہئے کہ امت کے نزدیک جن ائمہ کرام کو قبولِ عام حاصل ہوا، ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے رسول کی کسی خفیف یا روشن سنت کی مخالفت کی ہو۔ ان تمام ائمہ کا رسول کی اتباع کے واجب ہونے پر کامل یقین و اتفاق ہے۔ اور ان سب نے یہ کہا ہے کہ:

اِنَّ كُلَّ أَحَدٍ مِنَ النَّاسِ يُؤْخَذُ مِنْ قَوْلِهٖ وَيُتْرَکُ، اِلَّا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ

"رسول اللہ کے علاوہ ہر انسان کے قول کو لیا بھی جاسکتا ہے اور ترک بھی کیا جاسکتا ہے۔"

اس لئے اگر ان میں سے کسی کا کوئی فتویٰ ایسا ہے جو صحیح حدیث کے خلاف ہے تو اس ترک حدیث کے لئے ان کے پاس کوئی عذر ضرور ہوگا، اور ان عذروں کی تین بنیادی اقسام ہیں جن سے ترک حدیث کے متعدد اسباب کی شاخیں نکلتی ہیں:

اول: یہ اعتقاد کہ یہ حضور ﷺ کا فرمان نہیں ہے۔

دوم: یہ اعتقاد کہ اس فتوے سے اس فرمان رسول ﷺ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

سوم: یہ اعتقاد کہ اس حدیث کا حکم منسوخ ہے۔"

بعض لوگوں کی یہ بات کلی طور پر نا قابل قبول ہے کہ فقہی مسالک کی وجہ سے امت اختلاف کا شکار ہے۔ فروعی واجتہادی اختلاف اصلاً اسلامی وحدت کیلئے مضر نہیں ہیں۔ صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور ائمہ ہدیٰ کے درمیان فروعی واجتہادی امور میں اختلاف موجود تھا لیکن اس سے وحدت امت کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا، کیوں کہ یہ لوگ اختلافی امور میں اعتدال کی راہ سے واقف تھے۔

اسی طرح کچھ لوگوں کا یہ دعویٰ اور زعم بھی صحیح نہیں ہے کہ فروعی و اجتہادی امور میں نص اور حدیث کا وجود، باہمی اختلاف کے ازالے کے لئے اور پوری امت کو ایک رائے ومسلک پر جمع کردینے کیلئے کافی ہے۔ کیوں کہ کسی نص پر پوری امت کے متفق ہونے کے لئے ضروری ہے کہ پوری امت کے اہل علم اور مجتہدین درج ذیل امور میں باہم متحد و متفق ہوں۔

ضروری ہے کہ تمام مجتہدین کے نزدیک نص کی صحت مسلم ہو۔ معنیٰ و مراد کے لحاظ سے نص کی دلالت صریح اور واضح ہو۔ نص اپنے جیسی دوسرے نص یا اپنے سے قوی جزئی و شرعی نص یا شرعی کلی قواعد کے خلاف نہ ہو۔ کیوں کہ ایک نص ایک محقق اور مجتہد کے نزدیک صحیح ہوتی ہے تو وہی نص دوسرے مجتہد کے نزدیک ضعیف۔ ایک نص ایک امام کے نزدیک صحیح ہوتی ہے لیکن متعلقہ مسئلہ

میں، معنی و مراد پر اس کی دلالت اس کے نزدیک واضح اور صریح نہیں ہوتی۔ جب کہ دوسرے کے نزدیک صریح ہوتی ہے۔ ایک مجتہد کے نزدیک، ایک نص مطلق اور عام ہوتی ہے تو وہی نص دوسرے محقق کے نزدیک مقید اور خاص ہوتی ہے۔ ایک امام کے نزدیک ایک نص وجوب اور حرمت پر دلالت کرتی ہے تو دوسرے امام کے نزدیک وہی نص استحباب اور کراہت پر دلالت کرتی ہیں۔ ایک محقق ایک نص کو محکم مانتا ہے تو دوسرا مجتہد اسی نص کو منسوخ مانتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس لئے نص کے اتباع پر پوری امت کے متفق ہونے کے باوجود ضروری ہے کہ امت کے قدیم وجدید، سارے علماء، مجتہدین، نص سے متعلق، درج بالا تحقیق طلب امور میں باہم متفق وہم آواز ہو جائیں جن کا ذکر، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب رفع الملام عن ائمۃ الأعلام میں اور جیسے شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغۃ میں، امت کے باہمی اختلاف کے اسباب کے باب میں کیا ہے جن کی تحقیق میں اختلاف باہمی کی وجہ سے علماء مجتہدین کے درمیان، فروعی و اجتہادی امور میں باہمی اختلاف واقع ہوتا ہے۔

ان وجوہ و دلائل کی بنا پر کچھ لوگوں کا یہ خیال وگمان، حقیقت پر مبنی نہیں ہے کہ وہ نص کے ایک مفہوم و مدلول پر، پوری امت کے خاص و عام کو جمع کرنے کی صلاحیت وقدرت رکھتے ہیں جس کیلئے انہوں نے پوری کوشش اور تیاری بھی کرلی ہے۔ اس لئے امت کے ہر عام وخاص کو چاہئے کہ وہ ان کے اجتہاد پر جمع ہو جائیں، ان کی پیروی اور تقلید کریں، شرعی نصوص کے ان کے فہم و اجتہاد سے متفق ہو جائیں۔ اس طرح فقہی مسالک ختم ہو جائیں گے، امت کے درمیان اختلافات مٹ جائیں گے اور سارے مسلمان ایک کلمہ سَوَاء پر جمع ہو جائیں گے۔

لیکن یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ ائمہ مجتہدین کے مسالک کی اتباع وتقلید کو خطا اور گمراہی کہتے ہیں اور دوسری طرف پوری امت سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ ان کے اجتہاد کی اتباع و تقلید کرے۔ جب کہ نصوص کی صحت اور اس کی دلالت کے سلسلہ میں ان کا فہم بھی اجتہاد ہے اور

اجتہاد میں خطاء اور صواب، دونوں کا امکان ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ کسی بھی عالم یا مجتہد کے لئے جو اجتہاد کی ساری شرائط پر پورا اترتا ہو، اس کے لئے بھی اللہ نے خطائے اجتہادی سے عصمت کی ضمانت نہیں دی ہے۔ مجتہد کے لئے جو ضمانت ہے، وہ اجر کی ہے۔ اجتہاد، حق وصواب ہے تو دو اجر اور اگر خطا ہوگئی تو اس پر بھی ایک اجر کی بشارت ہے۔

اس لئے ان حضرات کی ان کوششوں اور جدوجہد سے نہ تو یہ مسالک ختم ہوں گے اور نہ ہی فروعی واجتہادی امور میں، امت کے درمیان اختلافات مٹیں گے البتہ موجود مسالک میں ایک جدید فقہی مسلک اور مزید اختلافات کا اضافہ، امت کے درمیان ضرور ہوجائے گا جس کا عملاً مشاہدہ آج ہر شخص کرسکتا ہے۔

تقلید محض نہ تو پوری امت پر واجب ہے اور نہ حرام:

حقیقت یہ ہے کہ تقلید کے باب میں عدل وتوسط پر مبنی بات یہ ہے کہ، تقلید محض نہ تو پوری امت پر واجب ہے اور نہ ہی پوری امت پر حرام۔ بلکہ شرع نے اہل علم اور عوام الناس کے درمیان فرق کیا ہے۔ ہر مسلمان جو احکام کے شرعی دلائل کو نہیں جانتا، اس کے لئے چاروں معروف ائمہ میں سے کسی نہ کسی کی تقلید کرنی چاہئے۔

البتہ بعض مسائل میں دوسرے ائمہ کی تقلید کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے؛ اور علماء کے لئے کسی ایک امام کی تقلید محض، مکروہ ہے۔ بطور خاص ان مسائل میں، جن میں ان پر اپنے امام کے فتوے کی کمزوری دلائل سے واضح ہوجائے۔

انہی مذموم تعصّبات میں سے ایک تعصب وہ بھی ہے جو کسی شخص، گروہ یا پارٹی کے لئے ہوتا ہے۔ وہ اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ جو کچھ ہمارے مقتدیٰ وپیشوا، رہنما اور قائدین کرام کہیں، یا جو ہماری جماعت یا پارٹی کہے وہ حق وصواب ہے جو عمل یہ کریں وہ بہترین اور قابل

اتباع ہے۔ ان کی پوری تاریخ شرف اور مجد کی تاریخ ہے اور ان کے سارے قائدین معصوم عنِ الخطاء ہیں۔ ہر گروہ اور جماعت جو اسلام کی نصرت وسربلندی کے لئے اور اسلام کی بنیاد پر، فرد ومعاشرے کی فکر وعمل کی تجدید کے لئے قائم ہوتی ہے، اپنے مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لئے قدم قدم پر اجتہاد اور نئے طریقوں کی دریافت اس کی ناگزیر ضرورت ہوتی ہے، اور اجتہاد میں خطا وصواب دونوں کا امکان ہوتا ہے اور مجتہد ہر حال میں اللہ کے اجر کا مستحق ہے بشرطیکہ اس کی نیت خالص ہو۔ کیوں کہ وہ معصوم عن الخطا نہیں ہوسکتا۔

کبھی کبھی اس مذموم تعصب کا مظاہرہ اس طرح بھی ہوتا ہے کہ پسندیدہ جماعت یا گروہ کی اجتہادی کوششوں کا ذکر، ہمیشہ باوقار انداز میں اس کے مناقب وفضائل کے ساتھ کیا جاتا ہے جب کہ دیگر جماعتوں کی اجتہادی کوششوں اور جدوجہد کا ذکر ہمیشہ عیوب ونقائص اور برائیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پسندیدہ قائدین کے اجتہادی قصور وخطا کے باوجود ان کی عظمت کا ڈنکا بجایا جاتا ہے اور ناپسندیدہ قائدین کی ہمیشہ تحقیر کی جاتی ہے خواہ وہ علم وفضل اور عمل خالص کے بلند مقام پر ہی کیوں نہ فائز ہوں۔

مذموم تعصب کا مظاہرہ یوں بھی ہوتا ہے کہ محبوب جماعت یا گروہ کی تنظیمی شکل وصورت کے تحفظ میں ایسی مبالغہ آرائی کی جاتی ہے کہ گویا وہ کوئی تعبدی امر ہے جسے ہمیشہ ایک حالت پر باقی رہنا چاہئے خواہ اس کی وجہ سے اسلام اور دعوت اسلامی کے مصالح ومفادات قربان ہوجائیں۔

جب کہ اللہ کی طرف سے ہر مسلمان پر یہ واجب ہے کہ وہ دوست اور دشمن دونوں کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرے۔ اگر اپنے والدین اور اعزا واقرباء بھی برسر غلط ہوں تو ان کے خلاف بھی اللہ کے لئے عدل وقسط کا گواہ بن کر کھڑا ہو۔ کسی دشمن کی دشمنی، اس کے خیر کے اعتراف میں مانع نہ ہو۔ غصہ اور نفرت، حق وصداقت سے انحراف کا سبب نہ بنے اور باطل وجھوٹ کی پیروی پر آمادہ نہ کرے۔ چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے کہ:

”اے لوگوں جو ایمان لائے ہو! تم عدل و انصاف کے قائم کرنے والے اور رضائے الٰہی کیلئے حق کی گواہی دینے والے بن جاؤ خواہ معاملہ خود تمہارے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور اقرباء کے خلاف۔“ (النساء:۱۳۵)

”کسی قوم کی دشمنی، تمہیں عدل و حق کے خلاف عمل کرنے پر آمادہ نہ کرے۔ عدل کرو، جو تقویٰ و پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے۔“ (المائدہ:۸)

آخری بات یہ کہ درج ذیل اخلاقی اوصاف کے بغیر، کوئی شخص، شخصی، جماعتی اور گروہی عصبیت سے آزاد نہیں ہوسکتا اس لئے ہر مؤمن پر واجب ہے کہ وہ خود کو ان اوصاف کا حامل بنائے۔ اس کی نظر اور توجہ، قائل کے بجائے، اس کے قول پر ہو۔ وہ اپنی غلطی و خطا کا فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کرسکتا ہو۔ وہ اپنی ذات کو خود تنقید کا نشانہ بنانے کی جرأت رکھتا ہو۔ وہ دوسروں کی تنقید کا خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کرسکتا ہو۔ وہ غیروں کے علم و حکمت کا اعتراف اور اس سے استفادہ کرسکتا ہو۔ وہ اپنے مخالفین کی خوبیوں کا اعتراف کرسکتا ہو۔ اور ان سے نصیحت و خیر خواہی کا طالب ہوسکتا ہو۔ اور اپنے مخالف پر لگائی ہوئی غلط تہمت کا دفاع کرسکتا ہو۔

غیروں کے ساتھ حسن ظن:

خود پسندی، مؤمنانہ اخلاق کے منافی ہے کہ وہ خود کو ہمیشہ حق پر سمجھے اور دوسروں کو برسرِ غلط ٹھہرائے۔ اس لئے اہل ایمان کو باہم ایک دوسرے کے موقف اور اعمال کا جائزہ لیتے وقت تعصب کی عینک اُتار کر، عدل و انصاف اور حسن ظن سے کام لینا چاہئے۔ اللہ نے مؤمنوں کو خود پسندی اور عُجب سے دور رہنے کی شدید تاکید فرمائی ہے۔ جو انسان کو ہلاکت سے دوچار کرنے میں سب سے زیادہ خطرناک اور شدید ہے۔ کیونکہ اللہ نے خود کو پاکباز سمجھنے اور اپنی تعریف آپ کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ یہود جو خود اپنی پاکبازی کا دم بھرتے تھے، ان کی مذمت کرتے

ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَا تُزَكُّوٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۔(النجم : ۳۲)

”پس تم اپنی پاکبازی آپ بیان نہ کرو۔ وہ اللہ خوب جانتا ہے کہ کون متقی اور پاکباز ہے۔“

اس لئے بعض سلف صالحین نے کہا ہے کہ مؤمن خود پسندی اور پاکبازی کے گھمنڈ سے پاک ہوتا ہے اور اپنے نفس کا احتساب کرنے میں ظالم بادشاہ اور شریک تجارت بخیل سے زیادہ سخت اور شدید ہوتا ہے۔ اور اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں جو کوتاہی اس سے ہوتی ہے، اس کا ذمہ دار وہ سب سے پہلے اپنے نفس کو قرار دیتا ہے۔

مخلص مؤمن نیکی و اطاعت میں سرگرم رہتا ہے۔ اللہ کے دین کی سربلندی و تبلیغ میں جان و مال کی قربانی کے لئے مستعد رہتا ہے۔ پھر بھی اسے ہر وقت یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ معلوم نہیں، میرے یہ اعمال، اللہ کے دربار میں مقبول ہیں یا نہیں!

مؤمن اپنے بارے میں اتنا چوکنا اور حساس ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے معاملے میں عزیمت کی راہ اختیار کرتا ہے اور عذر کے باوجود، رخصت پر عمل نہیں کرتا۔ لیکن اللہ کے بندوں کے عذرات کو وہ بلا تامل قبول کرتا ہے خصوصاً ان کارکنوں اور دینی بھائیوں کے عذرات کو جو اس کے ساتھ اللہ کے دین کی نصرت و اقامت میں شریک کار ہیں۔ اپنے ساتھیوں کے بارے میں سلف صالحین کا یہ قول اسے ہر وقت یاد رہتا ہے کہ میں اپنے بھائی کے ستّر بلکہ اس سے زائد عذر قبول کرسکتا ہوں۔ کیوں کہ شاید، میرے بھائی کے پوشیدہ حالات کچھ ایسے ہوں جن کی مجھے خبر نہ ہو۔

ایمان کا عظیم ترین درجہ اللہ اور اس کے بندوں کے ساتھ حسن ظن ہے۔ اس کے بالمقابل ایمان کا کمزور ترین درجہ اللہ اور اس کے بندوں کے ساتھ سوء ظن ہے۔ سوء ظن سے مراد ایسا خیال و گمان ہے جس کیلئے کوئی دلیل شرعی موجود نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے اس قبیح صفت سے یوں خبردار کیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ.(الحجرات:۱۲)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! زیادہ گمان کرنے سے بچو۔ حقیقت میں بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔“

حضور ﷺ نے فرمایا: اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ. (بخاری و مسلم)

”تم بدگمانی کرنے سے بچو۔ کیوں کہ حقیقت میں بدگمانی، سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔“

اس لئے ہر مؤمن پر یہ لازم ہے کہ جب بھی کسی مؤمن کے بارے میں اسے کوئی بری خبر ملے جو اس کے خلاف اسے سوءظن پر آمادہ کر رہی ہو تو بھی اسے حسن ظن سے کام لینا چاہئے۔ ایمان والوں کو اس سلسلہ میں واقعہ افک سے رہنمائی ملتی ہے:

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ● (النور : ۱۲)

”جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا، اسی وقت مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں نے کیوں نہ اپنے آپ سے نیک گمان کیا۔ اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے۔“

جب کسی مؤمن سے کسی ایسے عمل کا صدور ہو جس کے متعدد پہلو شر پر دلالت کرتے ہوں اور صرف ایک پہلو خیر پر دلالت کرنے والا ہو تو بھی اسے چاہئے کہ اس کو خیر پر محمول کرلے۔ اور اگر کوئی امکانی پہلو ایسا نہیں ہے جو خیر پر دلالت کرتا ہو تو بھی الزام لگانے میں جلدی نہ کرے۔ کیوں کہ عین ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں اس کا کوئی عذر ایسا سامنے آجائے جس سے وہ اس تہمت سے بَری ہو جائے۔ اور ملامت آپ کے حصے میں آئے۔

مسلم معاشرہ میں ایک دوسرے کے راز ٹٹولنا اور ٹوہ میں پڑنا انتہائی معیوب قرار دیا گیا ہے۔ حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔ اس خدا سے ڈرنا چاہئے جس سے کسی کا کوئی چھوٹا بڑا عیب پوشیدہ نہیں ہے اور جسے اللہ رسوا کرنا چاہے اسے لوگوں کے سامنے رسوا ہونے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔

یہ وہ مطلوبہ کردار ہے جس کا مظاہرہ عام مسلمانوں کو باہم کرنا چاہئے۔ رہے وہ لوگ جو اسلام

کے خادم اور داعی ہیں جن کے اندر اسلامی غیرت وحمیت ہے جو اسلام کے دفاع کے لئے ہمہ وقت مستعد ہیں اور اس کے راستے میں قربانیاں دے رہے ہیں انہیں اس معاملہ میں ضبطِ نفس، تحمل اور تقویٰ کے مقامِ بلند پر ہونا چاہئے۔ اس کا احساس ہر شخص خود کر سکتا ہے۔ اور اسی کے اعتبار سے اپنا ذاتی محاسبہ بھی کر سکتا ہے۔

نہایت افسوس اور تعجب ہوتا ہے جب اسلام کے لئے کام کرنے والے اور بڑی بڑی قربانیاں دینے والے، باہم ایک دوسرے پر خیانت اور بعض طاقتوں کے ایجنٹ ہونے کی تہمت علی الاعلان لگاتے ہیں محض اس بنا پر کہ اسلام کی سربلندی کے لئے جو طریقہ کار اور موقف ایک گروہ یا جماعت نے اختیار کیا ہے، دوسرا گروہ یا جماعت اس کا مخالف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسے دین کی ذرہ برابر سمجھ دی ہے، اس کے لئے اس طرح کا عملی مظاہرہ، کسی بھی حالت میں جائز اور درست نہیں ہوسکتا۔

اسلام کی سربلندی واقامت، سیاست کے میدان سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ ایسی سیاست جو دین اور شرعی اصولوں پر مبنی ہو، جس میں نقطۂ نظر، اور طریقہ کار کے اختلاف کے لئے وسیع میدان اور کافی گنجائش ہے۔ چنانچہ ایک ہی معاملے میں، مصالح اور مفاسد کے اندازے اور تعین میں لوگوں کے درمیان، نقطۂ نظر اور طریقہ کار کا کثیر اختلاف ہوتا ہے۔ ایک گروہ ابتدائی دعوتی مرحلے میں حاکم اور حکومت سے تعرض کو درست نہیں سمجھتا، تو دوسرا گروہ اس کو واجب وضروری سمجھتا ہے۔ اصلاح وانقلاب کے لئے ایک گروہ جمہوری سیاست کے طریقہ کار کو درست سمجھتا ہے تو دوسرا گروہ فوجی طریقہ کار کو۔ ایک گروہ مطلوبہ تبدیلی کے لئے، جمہوری طرز انتخاب میں حصہ لینا صحیح سمجھتا ہے تو دوسرا انتخاب میں شرکت کو عبث اور تضیع اوقات سمجھتا ہے۔

جو امور ومسائل مختلف فیہ ہیں اور اجتہاد سے تعلق رکھتے ہیں، اس میں مجتہد کا اجتہاد ہی حق ہوتا ہے اور اس کے اجتہاد ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ لوگ اس پر چلیں۔ اجتہاد صحیح ہے تو دو اجر، اور غلط ہے تو بھی مجتہد کو ایک اجر ملے گا۔ اس لئے اجتہاد میں غلطی پر نہ تو مجتہد اور اس کے پیروؤں کی

ملامت کی جاسکتی ہے اور نہ صواب ہونے پر اس کے اجتہاد کو قرآن وسنت کی طرح دوام کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

ان وجوہ ودلائل کی بنا پر کسی بھی شخص یا گروہ کیلئے یہ مناسب نہیں کہ وہ کسی شخص یا جماعت کے کسی اجتہاد کو قرآن وسنت کا درجہ دے کر اس سے ہمیشہ کیلئے چمٹ جائے ۔ خواہ حالات اور مصلحت کا تقاضا کچھ اور ہی کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ اس دائرے میں حالات وزمانے کے بدل جانے سے، مسئلہ اور اس کا حکم بدلتا رہتا ہے اور نئے پیش آمدہ حالات کی وجہ سے اجتہادی حلت، حرمت سے اور حرمت، حلت سے بدل سکتی ہے۔ کسی مخصوص شخص یا گروہ کے اجتہاد سے ہر حال میں وابستگی، اس وقت اور زیادہ خطرناک شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جب اس کے ساتھ بدگمانی اور نفس کی پیروی بھی جمع ہو جاتی ہے ۔ یہ وہ عیب ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ علماء کے قلب اور سماعت پر مہر لگا دیتا ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیتا ہے اور وہ علم کے باوجود گمراہی کے غار میں گر جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ مؤمنین کو خبردار کرتا ہے:

اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَاتَهۡوَی الۡاَنۡفُسُ ۚ وَلَقَدۡ جَآءَهُمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمُ الۡهُدٰی ۔ (النجم:۲۳)

یہ لوگ تو صرف گمان اور نفسانی خواہشوں کی اتباع کر رہے ہیں اور یقیناً ان کے رب کی طرف سے ان کے لئے رہنمائی آچکی ہے۔"

وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَیۡرِ هُدًی مِّنَ اللّٰهِ ؕ (القصص:۵۰)

"اور اس شخص سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کی رہنمائی کے بغیر، اپنی خواہش نفس کی پیروی کر رہا ہو۔"

ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اللہ کی رضا کے لئے اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ جدوجہد سے وحدت و اجتماعیت پیدا ہوتی ہے جب کہ خواہش نفس کی پیروی، تفرقہ واختلاف کو جنم دیتی ہے۔ کیوں کہ حق ایک ہے اور نفس کی تعداد اتنی ہی ہے جتنی کہ انسان ۔ رہی نفس کی خواہش تو وہ لاتعداد اور ہزاروں

میں ہے۔ امت کے اندر بے بنیاد اور غیر حقیقی گروہ بندی وفرقہ بندی کے اختلافات، خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، ان سب کو جس چیز نے سنگین اور ناقابل حل بنا دیا ہے، وہ یہی بدگمانی اور خواہش نفس کی پیروی ہے۔

الزام اور طعن وتشنیع سے اجتناب:

فروعی اور اجتہادی امور کے اختلاف میں باہم طنز وتشنیع اور الزام تراشی سے اجتناب، امت مسلمہ کے اتحاد اور اتفاق کے لئے ناگزیر ولازمی چیز ہے ۔ کیوں کہ دو مجتہدین کے دو مختلف اجتہادات میں سے کسی ایک اجتہاد کا لازماً صائب وبرحق ہونا یقینی نہیں ہوسکتا۔ زیادہ سے زیادہ ایک اجتہاد کو دوسرے اجتہاد پر ترجیح دے سکتے ہیں اور ترجیح بھی یقینی اور قطعی بنیاد پر نہیں بلکہ گمان غالب پر ہوتی ہے۔

اس لئے اجتہادی امور میں طنز وتشنیع اور الزام تراشی کسی بھی حال میں صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس دائرے میں خطا کرنے والا، صرف معذور ہی نہیں بلکہ نص حدیث کی رو سے ایک اجر کا مستحق بھی ہے۔ پھر وہ خطا جس پر مجتہد ماجور ہے، اس پر طعنہ وطنز کس طرح جائز ہوسکتا ہے۔ سلف صالحین، اجتہادی اختلاف میں ایک دوسرے پر طعن وطنز سے پرہیز کرتے تھے بلکہ اختلاف رائے کے باوجود، ایک دوسرے کے علم وفہم اور تقویٰ کی تعریف ہی کرتے تھے۔

آج اگر ایک طرف ایک مسلک کے لوگ، دوسرے مسلک اور اس کے امام پر زبان طعن دراز کر رہے ہیں تو دوسری طرف سلف اور حدیث کی اتباع کرنے والے لوگ، ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین پر طنز وتشنیع اور الزام تراشی کا تیر چلا رہے ہیں جب کہ ائمہ اربعہ کا تقویٰ، اخلاص، علم دین اور اتباع سنت سب کے نزدیک مسلم ہے۔

امت کے بعض دین دار حلقے یہ غلطی کر رہے ہیں کہ ایک شخص جو بحیثیت مجموعی اپنے علم دین،

اخلاص اوراجتہادی صلاحیت کے اعتبار سے نہایت ثقہ اور معتبر ہے۔اس کی معمولی خطاولغزش ان کی نظر میں اس کی ساری ثقاہت اور اخلاص پر پانی پھیر دینے کے لئے کافی ہے۔اگر اللہ تعالیٰ بھی بندوں کے ساتھ انہیں جیسا معاملہ کرتا جیسا کہ یہ لوگ دوسروں کے ساتھ کر رہے ہیں تو انبیاء و رسل کے علاوہ کسی بھی فرد بشر کو اس دنیا میں ہلاکت اور آخرت میں عذاب سے نجات نہ ملتی۔

لیکن اللہ انسانوں کے بارے میں ثواب یا عذاب کا فیصلہ ان کے غالب اعمال کی بنیاد پر کرتا ہے جن کے اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا وہ فلاح پائیں گے اور جن کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ ناکام و نامراد ہوں گے۔اس کے علاوہ، اللہ تعالیٰ کی شان کریمی کا حال یہ ہے کہ اپنے فضل و رحمت سے وہ بندوں کی نیکیوں کو دوگنا سے دس گنا اور اس سے بھی زیادہ بڑھاتا رہتا ہے۔جب کہ گناہوں کو ان کی اصلی حالت پر ہی رکھتا ہے۔اور اگر اس کے بندے کبیرہ گناہوں سے بچیں تو وہ ان کے صغیرہ گناہوں کو معاف کر کے مٹاتا رہتا ہے۔

خطا ونسیان کو اللہ تعالیٰ نے انسانی کردار کا لازمی حصہ بنا دیا ہے جس سے انسانی اعمال خالی نہیں ہوسکتے، جسے حضورؐ نے اس طرح بیان کیا ہے:

كُلُّ بَنِيْ آدَمَ خَطَاءٌ وَ خَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ ۔ (رواہ احمد)

''سارے انسان خطا کار ہیں اور توبہ کرنے والے بہتر خطا کار ہیں۔''

جب خود اللہ تعالیٰ انسانوں کے غالب اور اکثر اعمال کی بنیاد پر، جزاوسزا کا فیصلہ کرتا ہے تو ہمارے لئے بھی کسی انسان کو بھلا یا بُرا قرار دینے کے لئے اس کے غالب اعمال کا لحاظ کرنا ضروری ولازمی ہے۔اور کسی کی معمولی خطاؤں کی بنا پر اس کے سارے اچھے اعمال کو نامعتبر قرار دے کر، نظر انداز کر دینا صحیح اور منصفانہ عمل نہیں ہے۔نبی کریم ﷺ نے حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کی خطا پر ان کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے۔

جب حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے فتح مکہ سے پہلے اپنے خاندانی مصالح کے پیش نظر حضور

ﷺ کے ایک جنگی راز کو ایک عورت کے ذریعہ مکہ والوں پر خفیہ طریقے سے ظاہر کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اس کی خبر حضور ﷺ کو دے دی۔حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو عورت کے پاس سے خط برآمد کرنے کے لئے بھیجا۔حضرت علیؓ نے وہ خط اس عورت سے برآمد کرلیا۔اور جب حضرت عمرؓ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو انہوں نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے اس منافق کی گردن مارنے کی اجازت دی جائے! حضور ﷺ نے ان کی یہ درخواست رد کردی اور فرمایا کہ:

''اے عمر! تمہیں کیا خبر کہ کہیں اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو یہ بتا دیا ہو کہ میں تو تم کو بخش چکا ہوں، تم جو چاہو عمل کرو۔'' (رواہ البخاری)

حضورؐ کے اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ اس عظیم خیانت کے مانند گناہ کو، حاطبؓ کی سابقہ نیکیوں کے بدلے، شاید اللہ تعالیٰ، ان کو معاف کر چکا ہو۔

ایک ایسی ہی حکیمانہ بات ابوداؤدؒ نے اپنی سنن میں حدیث نمبر ۲۶۱۱ کے تحت بلند پایہ صحابی، حضرت معاذ بن جبلؓ سے نقل کی ہے کہ:

''خبردار! بدعت سے بچو، کیوں کہ بدعت گمراہی ہے۔اور میں تم کو حکیم کی خطا اور لغزش سے خبردار کرتا ہوں کیوں کہ بعض گمراہی کی باتیں شیطان، حکیم کی زبان سے بھی کہلواتا ہے اور بعض حق بات منافق کی زبان سے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ کسی بڑے سے بڑے متقی، حکیم اور فقیہ کی بات بھی آنکھیں بند کر کے ہرگز قبول نہیں کرنا چاہئے۔یہی بات حضرت علیؓ نے اس طرح کہی ہے کہ: ''تم بزرگوں کے اعمال کو سنت بنانے سے بچو''۔

بھول چوک کی طرح، اس امت کی خطا ولغزش بھی اللہ کے دربار میں قابل معافی ہے جس کی دعا اللہ تعالیٰ نے خود اہل ایمان کو سورہ بقرہ کے آخری رکوع میں سکھائی ہے:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِیْنَا أَوْ أَخْطَانَا.

"خدایا ہم سے جو بھول چوک یا غلطی ہوئی اس پر ہماری گرفت نہ کرنا۔"

اور صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ مؤمنوں کی اس دعا پر اللہ نے یہ کہہ کر اس کی قبولیت پر مُہر لگا دی ہے کہ "میں نے بخش دیا"۔ (غَفَرْتُ)

اور اسی بات کی وضاحت یہ حدیث بھی کرتی ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ تَجَاوَزَ لِھٰذِہِ الأُمَّۃِ عَنِ الخَطأ وَالنِّسْیَانِ وَمَا اسْتُکْرِھُوْا عَلَیْہِ. (رواہ ابن ماجہ و وافقۂ الذہبی والبیھقی)

"اللہ تعالیٰ نے اس امت کی خطاء، بھول چوک اور جبری گناہ سے درگزر، چشم پوشی اور معافی کا رویہ اختیار فرمایا ہے۔"

اختلافی امور میں سختی کے بجائے نرمی وفیاضی:

اسلام کی حفاظت اور سربلندی کے لئے کام کرنے والوں کو متنازعہ اختلافی رایوں میں باہمی بحث ومباحثہ کے دوران جھگڑا اور سختی سے پرہیز کرنا چاہئے۔ کیوں کہ اسلام نے مخالف کے ساتھ جدال احسن کا حکم دیا ہے۔ ایسا مباحثہ جس کا مقصد، ہر صورت میں فریق ثانی کی شکست اور اپنا غلبہ ہو، اسلام میں مذموم وناپسندیدہ ہے اور اہل کفر وشرک کا طریقہ ہے جس کی مذمت قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمائی ہے کہ:

وَیُجَادِلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِالبَاطِلِ لِیُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ. (الکھف :۵۶)

"کافر غلط اور باطل طریقوں سے جھگڑا اور بحث کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس طرح حق کو شکست دیں۔"

حضورؐ نے بھی اہل ایمان کے، اس ناپسندیدہ عمل سے بچنے والوں کو جنت کی ضمانت دی ہے

اور اسے سابقہ امتوں کی ضَلالت وگمراہی کا سبب بتایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"میں ذمہ دار اور ضامن ہوں جنت کے نچلے حصے میں محل کا، اس شخص کے لئے جو حق پر ہونے کے باوجود، جھگڑے وتنازعے سے دور رہے۔ اور جنت کے وسط میں محل کا، اس شخص کے لئے جو مذاق میں بھی جھوٹ بولنے سے بچے۔ اور جنت کے اعلیٰ حصے میں محل کا، اس شخص کیلئے جو اعلیٰ اخلاق کا حامل ہو۔" (رواہ ابوداؤد فی الادب)

مقام غور وفکر کا ہے کہ جب کوئی قوم توفیق الٰہی سے محروم ہو جاتی ہے تو وہ عمل کو ترک کر دیتی ہے اور مذموم جدال اور جھگڑے میں غرق ہو جاتی ہے۔ ہر انسان کی طبیعت میں فوقیت وبرتری کا جذبہ اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ اگر ایمان اور عمل صالح اس کی خواہشات اور تمناؤں پر لگام نہ لگائیں اور اس کو مہذب نہ بنائیں تو برتری اور تفوق کے زعم میں معاملہ جنگ وجدال تک پہنچتا ہی ہے۔

وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا ● (الکھف :۵۴)

"اور انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔"

آج دعوت اسلامی کے میدان میں ہم ایسے لوگوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں جو ہر معاملے میں جدالِ مذموم اور انتہا پسندی کا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ انہیں اس کی توفیق تو ہے نہیں کہ وہ مختلف اختلافی رایوں اور اجتہاد کے درمیان، اعتدال وتوسط کی راہ اختیار کریں۔ اس کے باوجود، ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ کہیں یا کسی اختلافی معاملے میں وہ جو مؤقف اختیار کریں، دوسرے تمام لوگ بھی ان کی پیروی کریں۔ کیوں کہ یہ اپنے آپ کو ہمیشہ حق پر سمجھتے ہیں اور مخالفین کو ہمیشہ باطل پر۔

ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو کسی لفظ کو خاص اصطلاحی معنیٰ میں بولتے اور لکھتے ہیں جسے دوسرے اہل علم صحیح نہیں سمجھتے، تو وہ اس کے لئے مذموم جھگڑا برپا کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی ان کی رائے سے اتفاق کرلیں جب کہ علماء کا کہنا یہ ہے کہ اصطلاح کے بارے میں جنگ وجدال

درست نہیں ہے۔

ان میں وہ بھی ہیں جو فقہی مسالک کے لئے تعصب کی مذمت کرتے ہیں لیکن وہ خود نیا مسلک ایجاد کرتے ہیں اور اس کے لئے امت کے درمیان، بحث ومباحثہ کا طوفان برپا کرتے ہیں۔

ان میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو تقلید کو حرام کہتے ہیں لیکن مسلمانوں سے چاہتے ہیں کہ وہ ان کی تقلید کریں۔ وہ پرانے فقہاء کی تقلید کو غلط سمجھتے ہیں اور لوگوں سے اس مسئلہ پر ناپسندیدہ بحثیں کرتے رہتے ہیں اور خود بعض معاصر فقہاء کی تقلید کرتے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو ایسے فروعی و اجتہادی مسائل کے لئے معرکہ برپا کرتے ہیں جن میں خود صحابہ اور سلف صالحین کے درمیان اختلاف رائے تھا۔

مخالفین کے ساتھ لاحاصل وناپسندیدہ تنازعہ اور جھگڑالو پن امت مسلمہ کے لئے ایک آفت ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کی اللہ اور اس کے رسول نے مذمت فرمائی ہے۔ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں:

اِنَّ اَبغَضَ الرِّجَالِ اِلَی اللّٰهِ أَلَالَدُّ الْخَصِم ۔(رواہ مسلم)

’’اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ آدمی وہ ہے جو نہایت جھگڑالو ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے جھگڑالو پن کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

فَاِنَّمَا يَسَّرْ نٰهُ بِلِسَانِکَ لِتُبَشِّرَبِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوماً لُّدًّا ● (مریم:۹۷)

’’ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان پر آسان کر دیا ہے تا کہ آپؐ اس کے ذریعہ سے پرہیز گاروں کو خوش خبری سنادیں اور جھگڑالو لوگوں کو ڈرا دیں۔‘‘

سب سے زیادہ ناپسندیدہ، خطرناک اور مکروہ بحث ومباحثہ اور جھگڑا وہ ہے جو اس قرآن کے بارے میں ہوتا ہے، جو کہ تضاد اور اختلاف سے پاک ہے اور جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے باہمی اختلاف کو مٹانے کیلئے حَکَم اور قول فیصل کی حیثیت سے نازل فرمایا ہے۔ اگر یہی قرآن

اختلاف کا محل بن جائے تو وہ دوسرا معیار کون سا ہو گا جسے انسانوں کے باہمی اختلاف کو مٹانے کے لئے کسوٹی اور معیار بنایا جائے گا اور دوسرا مرجع کون سا ہے جس پر اعتماد و بھروسہ کیا جائے گا؟ آنحضورؐ نے ان لوگوں پر شدید غصہ وغضب کا اظہار کیا تھا جو قرآن میں ناپسندیدہ بحث ومباحثہ کر رہے تھے اور قرآن کی ایک آیت کے خلاف اس کی دوسری آیت سے استدلال کرتے تھے۔ چنانچہ فرمایا:

"المراءُ فی القُرآن کُفرٌ" وَقَالَهَا ثَلَاثاً۔(مسند احمد وابویعلی فی مسندہ)

’’قرآن میں جھگڑا کرنا کفر ہے۔ یہ بات حضورؐ نے تین بار دہرائی۔‘‘

عَنْ عَبْدالله بن عُمر قال: إن قُرَّاءَ كَانُوْاجلُوْساً بِبَابِ النَّبِيِّ فَقَالَ بَعْضُهُمْ: أَلَمْ يَقُلِ اللهُ كَذَا:وَقَالَ بَعْضُهُمْ اَلَمْ يَقُلْ اللّٰهِ كَذَا ؟فَسَمِعَ ذَلِکَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَخَرَجَ كَأَنَّمَا فُقِیَ فِیْ وَجْهِهٖ حَبُّ الرُّمَّانِ فَقَالَ : أَبِهٰذَا اُمِرْتُمْ ، اَنْ تَضْرِبُوْا كِتَابَ اللّٰهِ بَعْضَهٗ بِبَعْضٍ؟ اِنَّمَا ضَلَّتِ الْاُمَمُ قَبْلَكُمْ فِیْ مِثْلَ هٰذا. اِنَّكُمْ لَسْتُمْ مِمَّا هُنَا فِیْ شَیْءٍ اُنْظُرُوْاالَّذِیْ اُمِرْتُمْ بِهٖ فَاعْمَلُوْا بِهٖ، وَانْظُرُوْا الَّذِیْ نُهِيْتُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا عَنْهُ ۔(مسند احمد)

’’حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ چند قراء حضورؐ کے دروازے پر بیٹھے باہم بحث کر رہے تھے کہ ان میں سے ایک نے کہا کہ کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا ہے؟ اس پر دوسرے نے کہا کہ کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا؟ حضورؐ نے یہ بحث سنی تو باہر تشریف لائے آپ کا چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انار کا رس مل دیا گیا ہو۔ فرمایا کہ کیا تمہیں اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ تم اللہ کی کتاب کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے ٹکراؤ؟ تم سے اگلی امتیں اسی بیماری کی وجہ سے گمراہ ہوئیں۔ تم جو کچھ اس وقت کر رہے ہو، یہ بالکل لاحاصل کام ہے۔ صحیح طریقہ اور کام یہ ہے کہ دیکھو کہ کن کاموں کے کرنے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے تو ان کو کرو۔ اور دیکھو کہ کن باتوں سے تم کو منع کر دیا گیا ہے تو ان سے باز آجاؤ۔‘‘

بحث ومباحثہ میں احسن طریقہ:

باہمی اختلاف کے آداب میں بنیادی امر نرم روی اور اچھے طریقے سے باہمی مباحثہ ہے جسے قرآن نے جدال احسن سے تعبیر کیا ہے اور جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو دیا ہے:

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡھُمۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ ●

(النحل : ۱۲۵)

"اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے بحث وگفتگو کرو احسن طریقے سے۔"

اللہ کی اس ہدایت، موعظت اور جدال، کے درمیان جو نمایاں فرق ہم دیکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ موعظت اور نصیحت کا صرف حَسَن ہونا کافی ہے جبکہ جدال کا احسن، یعنی سب سے اچھا ہونا ضروری ہے۔ اس فرق کا راز یہ ہے کہ عام طور پر موعظت اور نصیحت کا کام ان لوگوں کے درمیان ہوتا ہے جو اپنے فکر وعمل یا بالفاظ دیگر، نصب العین اور طریقہ کار میں باہم متفق ہوتے ہیں۔ وہ صرف ایسی نصیحت کے محتاج ہوتے ہیں جو اچھی ہو اور یاددہانی وتذکیر کے لئے کافی ہو۔ جو ان کے دلوں میں نرمی پیدا کردے، جو ان کے دلوں کے زنگ کو صاف کرکے پھر سے روشن کردے، جو ان کے عزم وارادہ کو پختہ کردے۔

اس کے برعکس جدال عموماً دو مخالفین کے درمیان ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر فریقین، اختلاف کے اندازِ بیان میں ضد اور سختی کا لہجہ اپنا سکتے ہیں یا باہمی معاملہ میں ناانصافی کرسکتے ہیں یا بحث و مباحثہ میں نفرت ودل شکنی کا رویہ اختیار کرسکتے ہیں۔ اس لئے اللہ کی حکمت بالغہ کا تقاضا یہ ہوا کہ مخالفین کے ساتھ بحث ومباحثہ میں نرم روی کا سب سے بہتر افضل اور مثالی طریقہ اختیار کیا جائے تاکہ جدال اثر پذیر اور بارآور ہو۔ انہیں طریقوں اور اسلوبوں میں سے ایک یہ ہے کہ بحث و

مباحثہ میں مخالف کے ساتھ نہایت نرم، دلنواز اور خوبصورت اندازِ بیان اختیار کیا جائے۔ یہود و نصاریٰ کو خطاب کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے یَـٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتَابَ کا مؤثر اسلوب واندازِ بیان اختیار کیا ہے، وہ جدال احسن کا بہترین نمونہ ہے۔

قرآن میں سورۂ کافرون کے علاوہ مشرکوں اور کافروں کو، اے مشرکو! یا اے کافرو! سے خطاب نہیں کیا گیا ہے حالانکہ اگر ایسا کیا جاتا تو کوئی خلافِ حقیقت خطاب نہ ہوتا بلکہ حقیقت کے عین مطابق ہوتا۔ لیکن انہیں یَـٰٓاَیُّھَا النَّاس سے خطاب کیا گیا ہے۔ اور سورہ کافرون میں یہ خطاب (اے کافرو!) اس وقت کیا گیا ہے جب ان تک دین پہنچایا جاچکا تھا، حجت پوری ہوچکی تھی، مکی زندگی کا آخری دور تھا اس موقعہ پر اس خطاب کا خاص مقصد تھا اور وہ یہ کہ مشرک اس بات سے ناامید ہوجائیں اور ان پر اچھی طرح یہ بات واضح ہوجائے کہ مسلمان اپنے بنیادی عقیدہ توحید میں کسی قسم کی مداہنت یا سمجھوتہ نہیں کرسکتے۔ اسی لئے ایک بات کو تاکیداً متعدد صیغے میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اور سورہ کے آخر میں لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ. (تمہارے لئے تمہارا دین اور ہمارے لئے ہمارا دین) کا اعلان کردیا گیا ہے۔ اور اسی طرح کا اعلان سورہ یونس میں یوں کیا گیا ہے:

"اور اب جب کہ انہوں نے۔ اے نبیؐ۔ آپ کو جھٹلا دیا تو آپؐ ان کے سامنے یہ اعلان کر دیں کہ میرے لئے میرا عمل ہے اور تمہارے لئے تمہارا عمل ہے۔ تم میرے اعمال سے بری الذمہ ہو اور میں تمہارے اعمال سے بری الذمہ ہوں۔" (یونس: ۴۱)

بحث ومباحثہ اور جدال احسن کے اسلوب کا تقاضا ہے کہ ہماری نظر اختلافی امور ومسائل کے بجائے مشترک اور متفق علیہ امور پر جمی اور مرکوز رہے۔ اور دعوت کے وقت اس پر عمل کریں۔ اہل کتاب کے ساتھ جدال احسن کے طریقہ کی رہنمائی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تُجَادِلُوۡٓا اَھۡلَ الۡکِتَابِ اِلَّا بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ .... وَ قُوۡلُوۡٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیۡ

أُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ● (العنکبوت:۴۶)

"اہل کتاب کے ساتھ بحث ومباحثہ اس طریقہ پر کرو جو احسن اور بہترین ہو........اور صاف صاف اعلان کردو کہ ہم ایمان لائے اس کتاب پر جو ہماری طرف اُتری اور اس پر بھی جو تمہاری طرف اُتری۔ ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور اسی کے ہم فرمانبردار ہیں۔"

اہل کتاب کے ساتھ جدال احسن اور بحث ومباحثہ کی اس تعلیم سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مسلمان کو اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے ساتھ، باہمی اختلافی امور میں بحث و مباحثہ کے وقت انصاف، فیاضی اور عفو ودرگذر کا کیسا مظاہرہ کرنا چاہئے۔

علامہ رازیؒ نے جدال احسن کی جو گراں قدر تفسیر کی ہے، وہ ملاحظہ ہو:

"اگر باہم مباحثہ اور مجادلہ کے دوران، ایک فریق دوسرے سے کہتا ہے کہ تم خطاکار ہو، تمہاری بات غلط ہے تو دوسرا فریق فوراً مشتعل اور غضبناک ہوجائے گا۔ اور یہ جانی پہچانی حقیقت ہے کہ غصہ کے وقت فکر کی سلامتی اور عقل وفہم کا سکون درہم برہم ہوجاتا ہے، اور فکر کے انتشار کے دوران فہم اور قبول حق کی امید نہیں کی جاسکتی جس سے باہمی مباحثہ کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔"

اگر بات یہاں سے شروع کرتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں ہم دونوں میں سے کوئی ایک ضرور غلط اور خطاوار ہے اور غلطی پر جمے رہنا نہایت بری بات ہے اور حق وسچائی کی طرف لوٹنا ایک احسن اور پسندیدہ عمل ہے تو آؤ ہم دونوں مل کر غور وفکر کریں کہ ہم میں کون ہے جو خطاوار ہے اور کون حق پر ہے؟ تاکہ غلطی کرنے والے فریق پر حق واضح ہوجائے اور وہ تعصب وہٹ دھرمی کو چھوڑ کر حق کا دامن تھام لے۔ اس طرز تخاطب سے فریق مخالف کا دل قبول حق کے لئے تیار ہوجائے گا۔

نبی معصوم داعی ہوتا ہے اور اس کے مخالف ضال ومضل! (گمراہ) اس حقیقت کے باوجود، معصوم نبی کا خطاوصواب کے امکان میں، فریق مخالف کو برابری کا درجہ دینا، اپنے حق میں خطا کے امکان کو تسلیم کرنا، دعوت کی ایک نہایت حکیمانہ حکمت عملی ہے جس سے مخالف کے دل سے تعصب

وہٹ دھرمی کی شدت میں کمی ہوتی ہے۔ داعی کی قدر ومنزلت میں اضافہ ہوتا ہے اور مخالف پوری سنجیدگی سے داعی کی بات سننے کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے۔ اپنے نبی کی تعلیم وتربیت کے لئے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو۔

وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ .

(اور ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی ہوئی گمراہی میں۔) اسی حکمت بالغہ پر دلالت کرتا ہے۔

پھر مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ اور آپ کے مخالفین، دونوں کی برابری کی سطح کو کافی نہیں سمجھا اور حضورؐ کو حکم دیا کہ حق پر ہونے کے باوجود، جرم کے لفظ کی نسبت اپنی طرف کریں اور مخالفین کے معاندانہ اور مجرمانہ رویے کو عمل سے تعبیر کریں تاکہ ان کے قلب سے قبول حق کے موانع دور ہوجائیں۔ اور اعلان کریں کہ "جو جرم ہم نے کئے ہیں ان کے بارے میں تم سے سوال نہ ہوگا۔ اور جو عمل تم نے کئے ہیں، اس کی جوابدہی ہمیں نہیں کرنی ہے۔"

اس اعلان کی ایک حکمت یہ ہے کہ حق پر غور کرنے اور اس کو قبول کرنے میں جو نفرت، عداوت اور غصہ مانع ہوسکتا تھا، اس کے آنے کا موقعہ ہی نہ دیا جائے۔ بلکہ دل کے اندر قبول حق کی مزید آمادگی پیدا کردی جائے۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ مخالفین کو اس بات سے خبردار کردیا جائے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب ہر انسان سے اس کے اچھے اور بُرے عمل کا حساب لیا جائے گا۔ اس لئے جو اس دنیا میں بُرے اعمال سے بچے گا، وہ وہاں نجات پائے گا۔ اور جو جرم میں ملوث پایا گیا وہ ہلاک وتباہ ہوجائے گا۔"

"اسی بات کی تاکید کے لئے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ یہ اعلان بھی کردیں کہ" ہمارا رب اس دن ہم سب کو جمع کرے گا پھر ہمارے مابین ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کردے گا۔ وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے۔" اس اعلان کی حکمت یہ ہے کہ ان پر یہ بات واضح

کردی جائے کہ اگر خطا پر کوئی باز پرس نہ ہو تو بھی مجرد خطا اور جرم ایسی چیز ہے جس سے ہر انسان کو لازماً بچنا چاہئے جب کہ حقیقتِ واقعہ یہ بھی ہے کہ اس پر باز پرس لازمی ہے اور ہمارے ضمیر کی پکار کا لازمی تقاضا بھی۔ اور جواب دہی بھی اس علیم وخبیر رب کے سامنے ہوگی جو سینوں میں چھپے ہوئے رازوں اور آرزؤں سے واقف ہے۔'' (التفسیر الکبیر، جلد:۲۵، ص:۲۵۷)

رسولوں نے اپنی اپنی قوموں کے ساتھ جو جدال احسن اور دعوتی مباحثہ کیا ہے اس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان دعوتی مباحثوں میں رسولوں نے نہایت مناسب نرم اور دل میں اتر جانے والے الفاظ اور جملے استعمال کئے ہیں۔

اس وقت بھی جب کہ ان کے مخالفین نے ان کی مخالفت کی۔ طرح طرح سے ستایا۔ ان کو اور ان کی دعوت کو جھٹلا دیا۔ تب بھی رسولوں نے ان پر غصہ نہیں کیا، ان کو گمراہ، ذلیل، اور جاہل اور جہنمی نہیں بنایا۔ ان پر اپنی فوقیت اور برتری کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ انصاف اور برابری کا معاملہ کرتے ہوئے، نہایت انکساری کے ساتھ فرمایا کہ اب جب کہ تم خود کو حق پر سمجھتے ہوئے ہمیں جھٹلا چکے تو ہمارے لئے ہمارا عمل ہے اور ہم اس کے لئے مسئول ہیں اور تمہارے لئے تمہارا عمل ہے اور تم اس کے لئے جواب دہ ہو۔ اس لئے تم بھی انتظار کرو۔ اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں کہ کس کے اعمال کا انجام خیر پر ہونے والا ہے اور کس کے اعمال اسے تباہی وہلاکت سے دوچار کرتے ہیں۔

یہی وہ بات ہے جس کو سورہ ہود آیت نمبر ۱۲۰ تا ۱۲۲ میں حضورؐ کی تسکین اور اطمینان قلب کی خاطر، اور اہل ایمان کی نصیحت، بیداری اور آگاہی کے لئے یوں بیان کیا گیا ہے:

''اور اے نبی! یہ رسولوں کے احوال اور قصے جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں، یہ وہ خبریں اور باتیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں اور ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا۔ اور اہل ایمان کو نصیحت، بیداری اور آگاہی حاصل ہوئی۔ رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے، تو ان سے کہہ دو کہ تم اپنے دین وطریقے پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے دین وطریقے پر عمل کر رہے ہیں۔

انجام کار کا تم بھی انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہیں۔'' (ہود:۱۲۰ تا ۱۲۲)

یہ جدال احسن اور مباحثہ کا وہ نمونہ ہے جو رسولوں نے ان کفار کے ساتھ کیا ہے جنہوں نے ان کو اور ان کی دعوت کو جھٹلا دیا تھا۔ لیکن اس کے مقابلے میں، ایک خدا، ایک قرآن اور ایک رسول کی حامل امت کے بعض افراد آج فروعی اور اجتہادی مسائل میں اس طرح ایک دوسرے سے مباحثہ کرتے ہیں جیسے یہ علمی میدان کا مباحثہ نہ ہو بلکہ میدان جنگ کی لڑائی ہو۔ ان کے ہاتھوں میں قلم نہیں بلکہ تلوار ہو جس سے سرخ خون ہی ٹپکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات مناسب الفاظ اور جملوں کی نرمی اور احتیاط کے ساتھ استعمال، موانع ورکاوٹوں کو دور کرکے مشکلات کو حل کر دیتا ہے۔ اس لئے اسلام کے نام لیواؤں اور اس کے خادموں کو بحث ومباحثہ میں ایسے الفاظ وجملوں کا استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہئے جو قربت اور محبت کے بجائے دوری اور نفرت، اور اتحاد کے بجائے تفرقہ کو جنم دینے والے ہوں۔

حضور ﷺ کی یہ حدیث اسی بات پر دلالت کرتی ہے:

يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْ وَ بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا . (متفق عليه)

''آسانی پیدا کرو، مشکل میں نہ ڈالو۔ خوش خبری دو، متنفر نہ کرو۔''

اس ساری بحث کا مقصد اور حاصل یہ ہے کہ پوری دنیا میں دعوت الی اللہ اور شہادت علی الناس کے عظیم فرض منصبی کی ادائیگی کے راستے میں، آج ملت اسلامیہ کو جن داخلی وخارجی مسائل و چیلنجوں کا سامنا ہے ان کے دفاع اور مقابلے کے لئے امت مسلمہ متحد اور بنیانِ مرصوص بن جائے۔ فروعی اور اجتہادی امور ومسائل میں اس کا باہمی اختلاف، اس کو امت واحدہ اور بنیانِ مرصوص بننے میں مانع اور حائل نہ ہو۔ تاکہ ان عظیم مقاصد اور حسین خوابوں کی تعبیر ممکن ہو سکے، جن پر پوری امت مسلمہ متفق اور متحد ہے۔

لیکن آج یہ اعلیٰ وارفع مقصد اس وقت تک حاصل نہیں کیا جا سکتا جب تک امت کا سوادِ اعظم

ان علمی و اخلاقی بنیادوں اور اصولوں سے اچھی طرح باخبر اور پورے اخلاص کے ساتھ ان پر عمل پیرا نہ ہو۔ جن پر اتحاد و اتفاق کی عمارت قائم ہوتی ہے۔

اس لئے امت کا ہر عاقل و بالغ شخص، جو اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین حق ہونے، محمدؐ کے رسول ہونے اور قرآن کے دستور عمل ہونے پر راضی اور مطمئن ہے اس پر فرض اور لازم ہے کہ وہ فروعی و اجتہادی اختلاف کو، ان کی شرعی حدود میں رکھ کر، امت واحدہ بن جائے۔

زوال و پستی کے اس زمانے میں ''امتِ واحدہ اور بنیان مرصوص'' بننے کی اس مخلصانہ دعوت سے اعراض اور غفلت، ایسا عمل ہے جو نا قابل معافی ہے اور جو دنیا و آخرت دونوں مقامات پر ذلیل و رسوا کرنے والا ہے۔

اجتہادی اور فروعی اختلافات اور ملتِ اسلامیہ کا نصب العین

انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اسلام آیا ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے فطری اور بنیادی داعیات، جذبات اور خواہشات میں غیر متبدل ہے۔ اس کی ان بنیادی خصوصیات میں زمانے و حالات کی تبدیلی سے کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ یہ فطری داعیات ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہنے والے ہیں جن میں تبدیلی ناممکن ہے۔

دوسری طرف ان فطری اور بنیادی داعیات وخواہشات کی تکمیل کے لئے انسان، جن وسائل و ذرائع اور طریقوں کا استعمال کرتا ہے، ان میں زمانے اور حالات کی تبدیلی سے ہر آن اور ہمیشہ تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ بلکہ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ ایک ہی وقت وحالات میں، مختلف انسان اپنے فطری داعیات اور ضرورتوں کی تکمیل کے لئے الگ الگ وسائل و ذرائع کا استعمال بھی کرتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اس دنیا میں انسانوں کے دین کی حیثیت سے پسند فرمایا ہے۔ اس نے

انسان کی اسی فطرت وطبیعت کے لحاظ سے اسلامی تعلیمات کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے، جن کا ایک حصہ بنیادی اصولی اور قطعی ہے، اور دوسرا حصہ فروعی اور اجتہادی ہے۔ دین کا جو حصہ بنیادی اور اصولی ہے، اسے اللہ اور اس کے رسول نے فرائض، حدود اور حرام کا نام دیا ہے۔ جنہیں قرآن میں العلم، بینات اور محکمات کہا گیا ہے جو قرآن وحدیث سے واضح اور قطعی طور پر ثابت ہیں، جو اپنے ثبوت کے لئے مجتہدین کے محتاج نہیں ہیں، جن میں اجتہاد اور اختلاف حرام وممنوع ہے، جن میں حالات و زمانے کی تبدیلی کے فرق سے، کسی قسم کی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

انسانی زندگی کو عدل وانصاف اور صراط مستقیم پر قائم رکھنے، اس کو صلاح وفلاح سے ہمکنار کرنے اور انسانی سماج کو فساد اور بگاڑ سے بچانے کے لئے، ان فرائض اور حدود کا انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہمیشہ قائم و جاری رہنا ضروری ہے۔ انسانوں کی زندگیوں میں یہ اگر قائم اور محفوظ ہیں تو بالفاظ دیگر، اسلام قائم زندہ اور محفوظ ہے۔ جب اور جس زمانے میں ان میں کوئی فساد یا تبدیلی واقع ہو جائے گی تو اسی لمحہ اسلام میں فساد اور خرابی پیدا ہو جائے گی اور اسلام قائم و محفوظ نہیں رہ سکے گا۔

اسلام کا یہ حصہ درج ذیل امور اور عمل پر مشتمل ہے:

۱) عقائد میں توحید، رسالت، آخرت، تقدیر، فرشتے، اور زندگی بعد موت، حضور ﷺ پر نزول قرآن، ختم قرآن، آخرت میں اعمال کی جزاوسزا اور عصمت انبیاء پر ایمان وغیرہ۔

۲) وہ اعمال جو فرض ہیں: مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ دن رات میں پانچ بار متعین اوقات میں نماز کا قیام، ان کی رکعتوں کی تعداد، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی معروف شرائط اور متعین اوقات و مدت میں ان کی ادائیگی وغیرہ۔

۳) قتل، زنا، تہمت، چوری، وصیت اور وراثت سے متعلق حدود وغیرہ۔

۴) معاملات سے متعلق اصول اور حرام اشیاء مثلاً خون، مُردار، سُوَّر، جُوا، شراب، سود اور

غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا ذبیحہ وغیرہ۔

۵) وہ اصولی اور کلی قاعدے جو نص صریح یعنی قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں۔

مثلاً: لَا ضرر ولا ضرار اور ماجعل علیکم فی الدین من حرج اور یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العُسر۔ وغیرہ۔

قرآن کریم کی وہ تمام آیات مثلاً سورہ بقرہ، آیت 103 اور ایک 105۔ سورہ انفال آیت 46 اور سورہ شوریٰ آیت 14، جو یہود و نصاریٰ کی مثال دے کر امت مسلمہ کو تفرقہ اور باہمی مخالفت سے منع کرتی ہیں کیوں کہ وہ باہم ایک دوسرے کی حق تلفی اور دشمنی کی وجہ سے گروہوں اور فرقوں میں بٹ گئے اور بس دینِ اسلام کے اسی اصولی، بنیادی اور قطعی فرائض، حدود اور حرام کے اختلافات سے متعلق ہیں۔ یہ دینِ اسلام کا وہ دائرہ اور حصہ ہے جس میں اختلاف سے فرقہ بندی اور دین کا اختلاف وجود میں آتا ہے۔

اس کے برعکس دین اسلام کا دوسرا حصہ جو فروعی اور اجتہادی ہے، اسے قرآن وحدیث میں واضح، قطعی اور تفصیلی طور پر بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ اشاروں اور کنایوں کی صورت میں بیان ہوئے ہیں جو غور وفکر اور اجتہاد کے ذریعہ تاویل وتفسیر اور دلائل سے ثابت ہوتے ہیں، جن کی جزوی وفروعی تفصیلات کو امت کے علماء مجتہدین کے اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جن میں علماء کے درمیان ان کے علمی و عقلی تفاوت، عرف، مصالح کے تعین اور نص یعنی احادیث کے بیان میں تعارض کی وجہ سے فہم، نقطۂ نظر اور ترجیح کا اختلاف ہوتا ہے اور جس کا واقع ہونا ناگزیر ہے۔ فروعی اور اجتہادی امور میں واضح نص کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان دائروں میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اپنی رحمت سے عمل کی آزادی عطا فرمائی ہے۔ تاکہ حالات وزمانے کی تبدیلی اور معاملات کی متعدد شکلوں کی وجہ سے انسانی ضرورتوں کی تکمیل میں جو رُکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں انہیں اسلام کے مقرر کردہ اصول اور حدود کی روشنی میں بروقت اجتہاد کے ذریعہ دور کیا جاتا

رہے۔ اجتہاد میں اختلاف ہونا فطری بات ہے۔ جس طرح سارے انسانوں کے جملہ فروعی اختلافات کو مٹا کر ایک رائے و قالب میں ڈھال دینا ممکن نہیں، اسی طرح اجتہادی امور میں سارے علماء کو ایک رائے پر متفق کرنا بھی ناممکن ہے۔

ایک اہم اور ضروری نکتہ یہ بھی ہے کہ جس طرح شکل وصورت، عقل وفہم اور ذوق ومیلان کے درمیان انسانوں کا اختلاف، نوع اور توسع کا اختلاف ہے، تضاد اور ٹکراؤ کا نہیں، بالکل اسی طرح اجتہادی وفروعی امور میں مجتہدین کے درمیان اختلاف دین کی وسعت کا اختلاف ہے۔ دین کا اختلاف ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ جس طرح انسانوں میں عقل وفہم کا اختلاف، انسانی اثاثہ اور ثروت کی مانند ہے جو ہمیشہ انسانوں کی فلاح و بہبود اور اس کی ترقی کا ضامن اور ذریعہ ہوتا ہے، بالکل اسی طرح مجتہدین کے درمیان فروعی امور کا اجتہادی اختلاف بھی دین اسلام کی قوت، ثروت اور اللہ کی حکمت ہے۔ اللہ نے اپنی اسی حکمت، عنایت اور رحمت سے دین اسلام کو ابدی و دائمی دین بنایا ہے، یہ دین اسلام کی ایسی قوت، سرمایہ اور ہتھیار رہے، جس سے زمانہ اور حالات کے پیدا کردہ نت نئے مسائل اور چیلنجوں کا مقابلہ اسلام اپنے مقرر کردہ اصولوں اور حدود کی روشنی میں اجتہاد کے ذریعہ ہمیشہ کرتا رہا ہے۔ اور آئندہ بھی کرتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مجتہدین کی اجتہادی خطاؤں پر بھی اللہ کی طرف سے انہیں ایک اجر ملتا ہے اور ثواب کی صورت میں دو اجر کی ضمانت ہے۔ ہمارے ہر شعبۂ زندگی کو جو چند حدود سے باندھ دیا گیا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ زمانہ اور حالات پر خواہ کتنے ہی حوادث اور تغیرات طاری ہوں۔ وہ ان حدود سے منحرف نہ ہونے پائے جو انسانی زندگی کو اس کے فطری حدود میں قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ یہ حدود اگر قائم ہیں تو زندگی کا ہر تغیر اور تبدیلی اسلام ہی کے تحت ہے۔ دین اسلام کے ان دائروں اور حصوں کا علم حضور ﷺ کی درج ذیل احادیث اور دین کی عملی تعلیم وتبلیغ میں صحابہؓ کے طریقوں سے ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر فرمائے ہیں تو ان کو ضائع نہ کرنا اور

کچھ حدود مقرر فرمائے ہیں تو ان کو نہ توڑنا اور کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے تو اس کے قریب نہ جانا۔ بھولے بغیر تم پر رحمت کی غرض سے کچھ چیزوں کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے تو ان کے بارے میں بحث و کرید نہ کرو۔ (دار قطنی، حسنہ النوی)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حلال کیا وہ حلال ہے اور جو کچھ حرام کیا ہے وہ حرام ہے۔ اور جن چیزوں کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے، تو یہ سکوت و خاموشی پر اللہ کی عنایت و فیاضی ہے۔ اس لئے اللہ سے اس کی فیاضی اور معافی کو قبول کرو۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ بھولتا نہیں ہے۔ (رواہ حاکم، صحیحہ ذہبی، واسنادہ حسن ورجالہ موثوقون)

مندرجہ بالا احادیث کا تقاضا ہم سے کیا ہے، اسے ہم اس وقت تک صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتے جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ نبی کریم ﷺ نے دین کی تعلیم کا کیا طریقہ اپنایا تھا۔ اور صحابہ کو کس طرح ان پر عمل کرنے کی تعلیم دی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے امت پر اللہ کی رحمت و عنایت کے پیشِ نظر صحابہ کو فروعی امور میں غیر ضروری انہماک اور تشدد پر ہلاکت کی خبر اس طرح دی:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جو طریقہ اور عمل کا نمونہ میں نے تمہارے درمیان چھوڑا ہے اس کو کافی جانو، کیوں کہ تم سے پہلے کی امتوں کے ہلاکت کی وجہ (دین کے جزوی امور میں) سوال کی کثرت اور اپنے انبیاء کے طریقے سے اختلاف تھا، اس لئے کسی چیز سے جب میں تمہیں منع کروں تو تم اس پر رک جاؤ اور جب کسی بات حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اس پر عمل کرو۔“ (رواہ احمد والشیخان والنسائی وابن ماجہ)

یہ حدیث ذبیحہ گائے کے حکم سے متعلق ہے۔ اور بنی اسرائیل کے سوالوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے، جو گائے کی جزوی تفصیل جاننے کے لئے موسیٰ علیہ السلام سے کئے گئے تھے۔ وہ جزوی تفصیل کے کرید میں نہ پڑتے تو جو گائے بھی ذبح کر دیتے تو حکم پر عمل ہو جاتا۔ لیکن جزئیات کے تعین کے بعد کچھ مخصوص قسم کی گائے کا ملنا ایک مشکل اور دشوار کام ہو گیا اور تلاش و جستجو کی بڑی

پریشانیوں کے بعد وہ اس حکم پر عمل کر سکے۔

حضرت انسؓ بیان فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ سے کچھ پوچھا اور سوال کو بار بار دہرایا، تو حضور ﷺ غصہ ہو گئے اور ممبر پر چڑھ کر فرمایا۔ تم لوگ آج جن چیزوں کے بارے میں بھی سوال کرو گے میں اس کا مفصل جواب تمہیں دوں گا۔ حضور کا غصہ اور اندازِ بیان دیکھ کر صحابہ منہ ڈھانک کر رونے لگے تو حضرت عمرؓ نے فوراً کھڑے ہو کر فرمایا۔ ہم اللہ کے رب ہونے پر، محمد ﷺ کے رسول ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر راضی اور خوش ہیں اور ہم فتنے سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ (متفق علیہ)

چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہؓ کے زمانے میں دینِ اسلام پر عمل میں سہولت اور آسانی کو ملحوظ رکھا جاتا تھا، لیکن بعد کے زمانے میں مبالغہ، سختی اور بال کی کھال نکالنے کو اچھا اور افضل سمجھا جانے لگا۔ فروعی امور میں اللہ نے جو آسانی و سہولت عطا کی تھی اس کو مشکل اور حرج سے بدل دیا گیا۔ نبی کریم ﷺ صحابہ کو دین کی تعلیم کس طرح دیتے تھے اس کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ وضو کرتے اور صحابہ کرامؓ آپ کے عمل کو بغور دیکھتے، اور اسی طرح خود وضو کرنے لگتے جیسا کہ دیکھا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ وضو کے فرائض اور مستحبات کتنے اور کون سے ہیں؟ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے نماز ادا کی، صحابہ نے آپ کی نماز کو بغور دیکھا اور اسی طرح خود نماز ادا کرنے لگے۔ جیسا کہ حضور کو دیکھا تھا۔ اس زمانے میں دین کی تعلیم کا یہ نمایاں پہلو تھا۔ نہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو بتایا اور نہ صحابہ نے پوچھا کہ وضو، نماز اور حج کے کتنے اور کون سے اعمال واجب، سنت اور مستحب کے حکم میں ہیں۔ پورے جزیرۃ العرب سے لوگ دین کی تعلیم کیلئے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے، دو چار دن ہفتہ، عشرہ آپ کے پاس تعلیمِ دین کیلئے قیام کرتے، حضور انہیں دین کے بنیادی فرائض، حدود اور حرام اشیاء کے علم سے آگاہ کرتے۔ اور وہ خود نبی کریم

ﷺ کے عمل کو دیکھ کر طہارت، وضو، غسل اور نماز وغیرہ کی عملی تعلیم اور طریقے حضور سے سیکھتے، یہ جانے اور پوچھے بغیر کہ وضو اور نماز وغیرہ کے فرائض اور مستحبات کتنے اور کون سے ہیں؟ اس عملی اور بنیادی تعلیم کے بعد نبی کریم ﷺ انہیں دین اسلام کی تعلیم پر مامور کر کے واپس ان کی قوم میں بھیج دیتے۔ نبی کریم ﷺ کے اس طرزِ تعلیم اور مختلف زمانے اور اوقات میں فروعی اور جزوی طور پر عمل میں صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف پایا جاتا تھا، کیوں کہ صحابہ کرام نے حضور کے عمل کو ایک ساتھ نہیں، بلکہ الگ الگ اوقات اور زمانوں میں دیکھا تھا، اس لئے جس صحابی نے حضور کو جس طرح نماز اور دیگر اعمال کو ادا کرتے ہوئے دیکھا آپ کی اتباع میں اسی طرح خود ادا کرنے لگے اور دوسروں کو اسی طریقے کی تعلیم دی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں لکھتے ہیں کہ فقہاء کے درمیان فروعی مسائل کے اختلاف کی اکثر صورتوں میں، ہر فقیہ کے پاس کسی نہ کسی صحابی کا قول یا اسوہ موجود ہوتا ہے جیسے ایام تشریق کی تکبیرات، عیدین، کی تکبیرات، نکاح محرم، تشہد وغیرہ، ابن عباسؓ و ابن مسعودؓ، بسم اللہ و آمین میں اخفاء یا جہر، اقامت میں ہر فقرہ کو دو دو بار یا ایک ایک بار دہرانا اور وتر کی رکعتوں میں تعداد وغیرہ جیسے فروعی امور میں فقہاء ایک صحابی کی رائے و عمل کو دوسرے صحابی کی رائے و عمل پر ترجیح دیتے تھے، کیوں کہ صحابہ کے درمیان ان اعمال کی مشروعیت کا اختلاف نہیں ہے بلکہ اولیٰ اور افضل کا اختلاف ہے۔

چنانچہ خلیفہ ہارون رشید نے جب امام مالکؒ کی کتاب ''موطا'' کو پورے اسلامی ممالک کا قانون بنانا چاہا اور اس کا ذکر امام مالکؒ سے کیا تو انہوں نے خلیفہ کو منع فرمایا اور کہا کہ صحابہ کے درمیان فروعی امور و معاملات میں باہم اختلاف تھا اور ان کو مختلف شہروں میں آباد ہوئے سالوں گزر چکے ہیں ان میں سے ہر ایک نے نبی کریم ﷺ اور قرآن سے علم کو اخذ کیا ہے اور اپنے اپنے علم اور اجتہاد پر عمل کر رہے ہیں۔ اجتہادی اور فروعی امور میں ہر ایک کو اپنے علم و اجتہاد پر عمل

کی آزادی کا حاصل ہونا ہی منشائے الٰہی ہے، اس لئے سب کو ایک مسلک پر جمع کرنا صحیح نہیں ہوگا، اور فتنہ کا مؤجب بھی ہوسکتا ہے۔

صحابہؓ و تابعینؒ میں کچھ لوگ نماز میں قرأت سے پہلے بسم اللہ پڑھتے تھے اور کچھ نہیں بھی پڑھتے تھے، کچھ بلند آواز سے پڑھتے تھے اور کچھ دھیرے سے، کچھ نماز فجر میں قنوت نازلہ پڑھتے اور کچھ نہیں پڑھتے، کچھ پچھنہ لگوانے، قے کرنے اور نکسیر پھوٹنے پر وضو کرتے اور کچھ نہیں کرتے، کچھ لوگ عورت اور عضو خاص کے مس کو ناقصِ وضو سمجھتے اور کچھ نہیں سمجھتے، کچھ لوگ اونٹ کا گوشت اور آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے پر تجدید وضو کرتے اور کچھ نہیں کرتے۔

مدینہ منورہ کے فقیہ قاسم بن محمد سے امام کے پیچھے نماز میں سورہ فاتحہ کی قرأت کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے جواب دیا کہ تم پڑھتے ہو تو صحابہ کے اُسوہ پر ہو اور نہیں پڑھتے ہو تو بھی صحابہ کے اُسوہ پر ہو۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ اگر صحابہ کرام اجتہادی و فروعی امور میں اختلاف نہ کرتے تو میں خوش نہ ہوتا، کیونکہ اگر سارے صحابہ کسی ایک اجتہادی رائے پر جمع ہو جاتے تو ان کی مخالفت کرنے والا گمراہ ہو جاتا۔ انہوں نے اجتہادی اور فروعی امور میں باہم اختلاف کیا تو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ امت کا ایک گروپ ایک صحابی کے علم و اجتہاد پر عمل کر رہا ہے، اور دوسرا دوسرے صحابی کے علم و اجتہاد پر۔ اس طرح دین پر عمل میں آسانی اور وسعت کا دروازہ کھل گیا ہے۔

چاروں ائمہ جن کے اجتہاد اور استنباط کے حق ہونے پر امت کا سوادِ اعظم متفق ہے، ان کے درمیان پاک و ناپاک اور حلال و حرام کا باہمی اختلاف پایا جاتا تھا، لیکن فروعی امور کا یہ اختلاف ان بزرگوں کے درمیان باہمی مخالفت، نفرت اور عداوت کا سبب نہیں بنا۔ بلکہ فروعی اختلاف کے معاملے میں انہوں نے امت اسلامیہ کے سامنے باہمی احترام کی نہایت اعلیٰ سنت اور قابل تقلید مثال قائم کی ہے۔ وہ جائز اور ناجائز کے اختلاف کے باوجود حسب موقع اور ضرورت پورے

اطمینانِ قلب کے ساتھ دوسرے مسلک پر عمل کرتے تھے۔ اوراس کو دین اسلام میں کسی قسم کی کوئی خرابی یا نقصان نہیں سمجھتے تھے، مثلاً امام ابو یوسفؒ نے جمعہ کے دن مدینہ منورہ میں ایسے پانی سے غسل کیا جو فقہ حنفی کی رو سے ناپاک تھا، غسل کے بعد انہیں پتہ چلا تو دوبارہ غسل نہیں کیا اور فرمایا میں اس وقت امام مالکؒ کے مسلک پر ہوں، امام شافعیؒ نے فجر کی نماز ابوحنیفہؒ کی قبر کے پاس والی مسجد میں پڑھائی تو امام ابوحنیفہؒ کے ادب کی وجہ سے حنفی مسلک پر عمل کیا اور قنوت نازلہ نہیں پڑھی، حالانکہ شافعی مسلک کی رو سے قنوت نازلہ کے بغیر فجر کی نماز ہی نہیں ہوتی۔ امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ اوران کے اصحاب وغیرہ مدینہ میں مالکی ائمہ کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے، جب کہ مالکی امام سری اور جہری دونوں نمازوں میں بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ خلیفہ ہارون رشید نے فصد کھلوانے کے بعد تجدید وضو کے بغیر نماز پڑھائی اور امام ابو یوسفؒ نے ان کے پیچھے نماز پڑھی اور بعد میں دہرایا نہیں، جب کہ حنفی مسلک کی رو سے فصد کے بعد وضو کرنا لازم ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ حجامت بنوانے کے بعد تجدید وضو کا فتویٰ دیتے تھے، جب ان سے ایسے امام کے پیچھے نماز ادا کرنے کے بارے میں پوچھا گیا جس نے حجامت کے بعد تجدید وضو کے بغیر نماز پڑھائی، تو انہوں نے جواب دیا کہ کیا میں امام مالک اور امام سعید بن المسیب کے پیچھے نماز نہیں پڑھوں گا؟ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ دونوں ہارون رشید کی رعایت سے عیدین کی نماز میں حضرت ابن عباسؓ کے مسلک کے مطابق تکبیریں کہا کرتے تھے، حالانکہ ان دونوں اماموں کا مسلک اس کے خلاف تھا۔

اجتہادی اور فروعی امور میں حلال وحرام میں اختلاف کے بارے میں ابن عبدالبرالنمر ی، جامع بیان العلوم (ج ۱ ص ۸۰) میں لکھتے ہیں، کہ فتویٰ دے کر عام لوگوں کو آزمائش میں ڈالتے ہیں حالانکہ ان امور میں ایک ہی مسئلہ میں حرام کا قائل، حلال کے قائل کے بارے میں یہ خیال نہ کرے کہ وہ اس کی وجہ سے گمراہ و ہلاک ہوگیا، اسی طرح حلال کا قائل، حرام کے قائل کے بارے میں یہ خیال نہ کرے کہ وہ اس کی وجہ سے گمراہ و ہلاک ہوگیا۔

اب تک کی گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ صحابہ اور ائمہ مجتہدین کے درمیان اجتہادی اور فروعی امور میں باہمی اختلاف کی وجہ سے، ان کے برادرانہ اور مؤمنانہ تعلقات اور احترام میں کسی بھی قسم کی کوئی کمی نہیں پیدا ہوئی اور نہ ہی انہوں نے اس کی وجہ سے اپنی مسجدیں الگ بنائیں اور نہ ہی ایک دوسرے کو گمراہی کا طعنہ دیا۔ اجتہادی اختلاف کی وجہ سے اگرچہ صحابہ کے درمیان باہم لڑائیاں بھی ہوئیں لیکن اس کے باوجود وہ مذموم گروہ بندی اور فرقہ بندی کا شکار نہیں ہوئے۔ اور باہم لڑائی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو مؤمنین کے دو گروہ کہا۔ اور دیگر اہل ایمان کو حکم دیا کہ تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ۔ اور جو فریق صلح کے لئے تیار نہ ہو اور ظلم کرے تو تم اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ صلح پر آمادہ ہو جائے۔ اور جب دونوں صلح پر آمادہ ہو جائیں تو ان کے درمیان اللہ سے ڈرتے ہوئے عدل وانصاف کے مطابق صلح کرا کے بھائی بھائی بنا دو۔ اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت سے یہ معلوم ہوا کہ اگر باہم لڑنے والے صلح نہ کریں اور دوسرے اہل ایمان صلح صفائی کی کوشش نہ کریں تو پوری امتِ اسلامیہ اللہ کی رحمت سے محروم اور غضب سے دوچار ہو جائے گی۔ وہ مسلمان جس کا خون، عزت و مال دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کی تشریح کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو مسلمان ہماری طرح نماز ادا کرے، ہمارا ذبیحہ کھائے اور ہمارے قبلہ کا رخ کرے وہ مسلم ہے۔ اس کا ذمہ اللہ اور اس کے رسول نے لیا ہے، اس لئے آج مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ باہمی دشمنی اور گروہ بندی کو ترک کر دیں۔ اگر ایک گروہ دوسرے کے اندر کوئی خامی دیکھتا ہے تو محبت نرمی اور حکمت کے ساتھ اس کی اصلاح کی کوشش کرے اور اصلاح میں جلد کامیابی نہ ملے تو مایوس نہ ہو، اللہ سے دعا اور اصلاحِ احوال کی جدوجہد کو ہرگز ترک نہ کرے۔ لیکن آج ہمارا حال یہ ہے کہ اللہ، رسول، صحابہ وسلف صالحین کی محبت اور اتباع کا دعویٰ کرنے والے، رسول اور صحابہ وسلف کے راستے کو چھوڑ کر باہم فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ اپنی اپنی مسجدیں الگ بنالی ہیں۔ رفع یدین، آمین بالجہر یا بالسر، درود وسلام اور اقامت الصلوٰۃ کے وقت

بیٹھنے یا کھڑے ہونے کے فروعی مسائل کو لے کر ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کی جان، مال اور عزت کو اپنے لئے حلال کرلیا ہے۔ باہمی تمسخر، طعنہ، برے القاب، ظن و تجسس، غیبت، نجویٰ اور چغل خوری کا ارتکاب پوری دیدہ دلیری کے ساتھ اور علی الاعلان مسجد و محراب سے ہو رہا ہے۔ کسی کو ذرہ برابر ہوش نہیں کہ یہ وہ گناہ کے کام ہیں جن سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے نہایت واضح الفاظ میں منع فرمایا ہے۔ اور یہ وعید سنائی ہے کہ جو لوگ ان گناہوں سے توبہ نہ کریں وہی لوگ ظالم اور فاسق ہیں اور انہیں کے لئے اللہ نے آگ بھڑکا رکھی ہے۔ اور ہماری اس باہمی لڑائی کی وجہ سے اسلام اور امت مسلمہ دونوں کی نفع بخشی اور افادیت سے لوگوں کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے۔

آج اسلام اور مسلمانوں کی سر بلندی کے لئے کام کرنے والوں پر، سب سے پہلے فرض یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی کوشش اور جدو جہد کو، امت کے درمیان متفق علیہ امور پر مرکوز کر دیں۔ اور امت جن امور و مسائل میں متفق اور متحد ہے ان میں باہمی تعاون کا آغاز کریں، کیوں کہ متفق علیہ امور میں باہمی تعاون فریضہ بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی۔ یہ وہ فریضہ ہے جسے اسلام نے عائد کیا ہے اور وہ ضرورت ہے اور جو اللہ و رسول کا حکم اور حالات کا تقاضا ہے۔

جو چیزیں امت کے درمیان متفق علیہ ہیں، وہ حقیر، جزوی اور کمتر نہیں ہیں بلکہ وہ دین کے بنیادی عقائد، فرائض، حدود اور حلال و حرام وغیرہ ہیں۔ ضرورت صرف ایسی باہمی کوشش کی ہے جس میں کوئی توقف اور خلل نہ ہو، ایسے عمل کی ہے جو کسی سہارے کا محتاج نہ ہو، ایسے مضبوط عزم و ارادہ کی ہے جس میں کوئی کمزوری نہ ہو، ایسی بیداری عقل کی جو صحیح رہنمائی پر قادر ہو، ایسے ایمان و یقین کی ہے جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے، ایسے پاک نفوس جوانوں کی ہے جو اخلاص کا پیکر اور جذبۂ عمل سے سرشار ہوں، ایسی اجتماعی قوت و طاقت کی جو اسلام کی صحیح رہنمائی میں تعمیرِ جدید پر قادر ہو۔

آج امت کے تمام مفکرین اور داعیان اسلام پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کو دین کے اصولوں اور بنیادوں پر جمع کر کے، ان کو ایسے اتحاد و اجتماعیت میں باہم جوڑ دیں جسے اللہ نے بنیان مرصوص اور امتِ واحدہ کہا ہے۔ اور یہ امت ایسی جامع اور انقلابی امت وسط بن جائے جو اسلام کے مثبت فکر و فہم کی جامع امت ہو، ثوابت و تغیرات کے درمیان، توازن کی حامل امت۔ میراثِ اسلام کے تحفظ کے ساتھ مستقبلِ اسلام کے لئے منصوبہ ساز امت۔ اجتہادی و فروعی مسائل میں اپنے اپنے علم و اجتہاد اور مسلک پر عامل رہتے ہوئے، امت واحدہ کی تعمیر جدید پر قادر امت، تاکہ جس تواصی بالحق، تواصی بالصبر، شہادت علی الناس، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اقامت دین کی گراں بار ذمہ داری کا بوجھ اللہ تعالیٰ نے پوری امتِ اسلامیہ پر ڈالا ہے، اس کا اٹھانا اور حق ادا کرنا امت کے لئے آسان اور سہل ہو جائے۔

(ختم شد)

زیر اہتمام: محمد صدیق قریشی
Pixel Arts
Mobail : 9820790615
Printed at : Fatima Printers
Tilak Nagar , Saki Naka Mumbai 400070

مطبوعات، ادارہ دعوۃ القرآن

تالیف : **شمس پیرزادہؒ**

☆جلداوّل سورہ فاتحہ تاسورۂ عنکبوت پارہ ۱ تا ۲۰ صفحات ۱۳۸۸ — 750/-

☆جلددوم سورۂ روم تاسورۂ ناس پارہ ۲۱ تا ۳۰ صفحات ۱۱۲۷ — 450/-

☆سورۂ فاتحہ — 8/-

☆پارہ عم — 70/-

اس تفسیر کے مراٹھی، گجراتی، ہندی اورانگریزی تراجم بھی موجود ہیں۔

دیگراردو مطبوعات

☆تنویرالحدیث صفحات ۲۰۸ — 80/-

☆جواہرالحدیث صفحات ۱۹۲ — 60/-

☆ ابھرتے معاشرتی مسائل — 25/-

☆شادی کے شرعی اور غیر شرعی طریقے — 14/-

☆طلاق کب اور کیسے؟ — 6/-

☆اکٹھی تین طلاقیں؟ — 10/-

☆یہ کیسا بگاڑ ہے؟ — 7/-

☆یہ کیسی دینداری ہے؟ — 16/-

☆کیا قرآن کو سمجھ کر پڑھنا ضروری نہیں؟ — 6/-

☆قرآن کا انداز بیان — 6/-

☆موضوع اور ضعیف حدیثوں کا چلن — 9/-

☆حجیت حدیث اور۔۔۔ — 10/-

☆سنو اپنے رب کی — 10/-

☆رویت ہلال کا مسئلہ — 8/-

☆ مطالعۂ قرآن کی ضرورت واہمیت تالیف: مولانا ریاض احمد — 12/-

☆اتحاد ملت ضرورت اہمیت اور طریقہ تالیف: مولانا ریاض احمد — /-

☆محمد ﷺ مشن اور کردار تالیف: مولانا ریاض احمد — 10/-

☆اولاد کی تربیت تالیف مولانا ریاض احمد — 10/-

☆فقہ الزکوۃ تالیف: ڈاکٹر یوسف القرضاوی اردو ترجمہ وتلخیص: شمس پیرزادہؒ — 180/-

☆عربی ، وجوب تطبیق الشریعة الاسلامية فی کل زمان و مکان — 2/-

بیشتر کتابوں کے مراٹھی، گجراتی، ہندی اورانگریزی تراجم بھی دستیاب ہیں۔

ادارہ دعوۃ القرآن ۵۹ ر محمد علی روڈ ممبئی ۴۰۰۰۰۳ ☐ فون: ۲۳۴۶۵۰۰۵

دعوۃ القرآن

ترجمہ وتفسیر پانچ زبانوں میں

تالیف : **مولانا شمس پیرزادہؒ**

اردو	سیٹ	1200/-
مراٹھی	سیٹ	360/-
گجراتی	سیٹ	830/-
ہندی	سیٹ	1180/-
انگریزی	سیٹ	1125/-
پارہ عم اردو		70/-
پارہ عم گجراتی		65/-
پارہ عم ہندی		120/-
پارہ عم انگریزی		150/-

ادارہ دعوۃ القرآن

۵۹۔محمد علی روڈ۔ممبئی ۴۰۰۰۰۳ ☆ فون: ۲۳۴۶۵۰۰۵